آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جولائی 2021

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

National Council for Promotion of Urdu Language

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

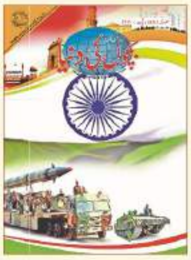

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیاہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
چراغ راہ	محض اصحاب قلم نہیں بلکہ قائدین فکر ونظر	ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک'	5
شخصیت	بانو طاہرہ سعید کی افسانہ نگاری	ظفر الاسلام	7
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		13
جہان نسواں	خواجہ حسن نظامی کا اسلوب	ڈاکٹر چمن آرا خان	14
	درسیات اور قومی تعلیمی پالیسی۔2020	ڈاکٹر وقار النساء	19
	مولوی نجم الغنی کی تاریخ نگاری	ڈاکٹر شہناز بیگم	23
	ناز قادری کی ادبی خدمات	ڈاکٹر گلشن آرا	29
	جیلانی بانو کی تخلیقی انفرادیت	نوشین عثمانی	34
	'بستی' کا نسائی تجزیہ	ڈاکٹر رابعہ ناز	37
شناخت:	عطیہ بی اوران کی کہانیاں	محمد اویس سنبھلی	41
کہانیاں	خراٹے	ڈاکٹر شبنم رضوی	45
	دل کی آنکھیں	ترنم جمال	47
	خاموشی کا بوجھ	ڈاکٹر وفا یزدان منش	49
حسن سخن	شبانہ عشرت، ڈاکٹر حنا شائم		53
باورچی خانہ			55
صحت	رحم کی رسولی: خواتین کا ایک عام ٹیومر	ڈاکٹر احسان رؤف	57
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61
خواتین خبرنامہ			62

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 7 جولائی 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages **64**

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

کسی بھی صحت مند معاشرے میں بچوں اور کتابوں کے درمیان ایک ربط ہوتا ہے۔ بچوں کا ادب ہمارے لیے نہایت اہم ترین سرمایہ ہوتا ہے۔ یہ ربط ہی بچوں کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ کہانیوں کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے اور بچوں کے ذہن میں تجسس پیدا کرتی ہے۔ ان کے اندر نئی کہانیاں سننے کا تجسس ہی ان کو ادب اطفال سے جوڑے رکھتا ہے۔ رسالوں کے ذریعہ بھی اردو زبان میں بچوں کا بہت سا معیاری ادب تخلیق ہوا ہے۔ اردو رسالوں نے بچوں کے ذہنوں کی آبیاری کی ہے اور ان کی ذہنی نشوونما کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ آج ادب اطفال ہمارے سامنے کئی روپ میں موجود ہے۔ اردو ادب اطفال میں نثر کی کئی صنفوں کے ذریعہ ہی ادب اطفال میں طبع آزمائی کی جاتی رہی ہے۔ ادب اطفال سنجیدہ ادب کی طرح بچوں کے لیے ایک باغ کی مانند ہے جس میں بچے اپنی پسند اور ذوق کے اعتبار سے اپنی تفریح کا سامان تلاش کرتے ہیں۔ قصے، کہانیاں، ڈرامہ غرض تمام اصناف میں ادب اطفال کو پیش کیا گیا ہے۔ خواتین نے بچوں کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ادب اطفال سے خواتین کے لگاؤ کی وجہ ان کی شفقت، ممتا اور پیار کو قرار دی جاسکتی ہے۔ ان تمام خواتین نے بچوں کے لیے لاتعداد کہانیاں اور ادبی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ چونکہ بچپن میں بچوں کا ذہن معصوم ہوتا ہے اس لیے ان کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر روایتی کہانیاں سنانے کا رواج ہے۔ بچپن سے ہی ہم اپنی نانی دادی کے ذریعہ کہانی سنتے ہیں۔ یہ روایت صدیوں سے جاری ہے اور موجودہ دور میں بھی اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی خواتین نے بچوں کے لیے نہایت آسان زبان میں کہانیاں لکھیں جو ان کے لیے معاون ثابت ہوئی ہیں۔ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بھی یہ کہانیاں بہت عمدہ ہیں۔ اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں بھی خواتین نے تحریر کی ہیں۔

ادب اطفال میں بھی خواتین نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بہت سی ایسی خواتین ہیں جنھوں نے ادب اطفال کے ذریعے بچوں کی ذہنی نشوونما کی ہے۔ لیلیٰ خواجہ بانو، صالحہ عابد حسین، آصفہ مجیب، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، اے آر خاتون، واجدہ تبسم، عفت موہانی، عطیہ پروین، مسعودہ حیات، خدیجہ مستور، رفیعہ منظور الامین، شفیقہ فرحت، جیلانی بانو، سیدہ اعجاز، مشیر فاطمہ، ثریا فرخ، کشور ناہید، زیب النساء بیگم، عقیلہ بانو، نور جہاں نور، بانو سرتاج، شہناز نبی، قمر قدیر ارم وغیرہ ایسی خواتین ہیں نے ادب اطفال پر لکھا ہے۔ ان کے ذریعہ تحریر کردہ ادب کو ادب اطفال میں عمدہ کاوش قرار دیا جاسکتا ہے۔

بچوں کی اپنی نفسیات اور اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر بہت سی نئی قلم کار خواتین ادب اطفال کی طرف توجہ دے رہی ہیں۔ نئے قلم کاروں کے یہاں اسلوب میں نیا پن اور موضوعات میں رنگا رنگی ہے۔ ان کی کہانیوں کی اہم خوبی ان کے کردار و واقعات ہیں۔ نئی خواتین قلم کاروں سے ہمیں نئی توقعات وابستہ ہیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک'

محض اصحاب قلم نہیں بلکہ قائدین فکرونظر

(نوجوان قلمکاروں کے لیے وزیراعظم کی مینٹر شپ اسکیم)

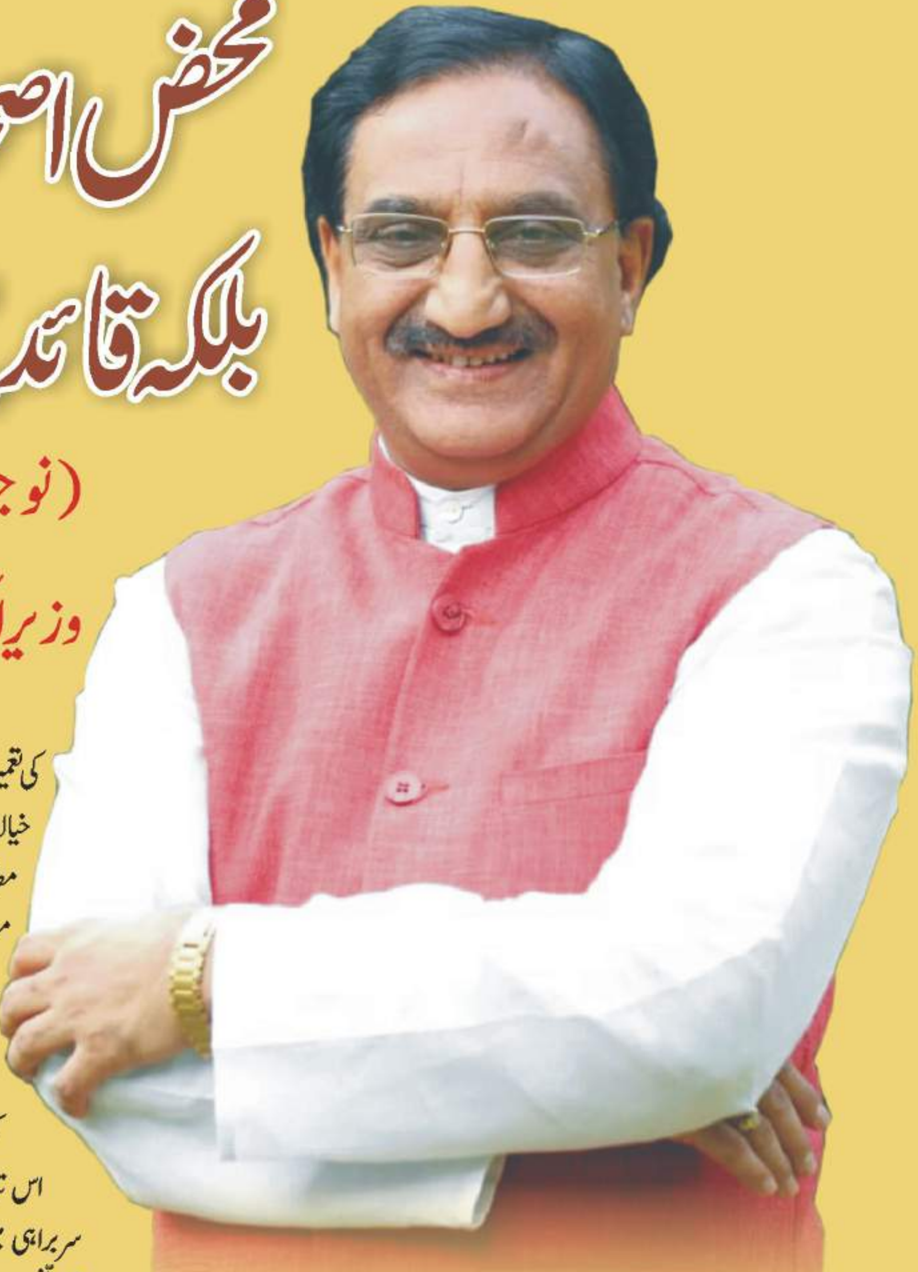

معاشرے میں مطالعے کے کلچر کے فروغ کے لیے مطالعے اور اس کے لیے ایک سازگار ماحول کی تشکیل یقینی طور پر معاشرے اور حکومت، دونوں کی ایک اہم ذمے داری ہے، لہٰذا کتابوں اور مواد مطالعہ خواہ طبع شدہ ہوں یا ڈیجیٹل شکل میں ان تک رسائی ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کا طبعی نتیجہ ہے، جو پڑھتا ہے، سوچتا ہے اور نئے خیالات کو آگے بڑھاتا ہے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مطالعہ کرنے والے معاشرے کو نئے تناظرات، نئے مواد مطالعہ اور ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جو نئے خیالات اور نئے مواد کو قبول کر سکے۔ اسی لیے تو ہمارے محترم وزیراعظم، جناب نریندر مودی کہتے ہیں ''جس ملک کے شہری مطالعہ کرتے ہیں، وہی دنیا کی قیادت کرتے ہیں۔''

اس تناظر میں، ہندوستان کے دوراندیش وزیراعظم کی سربراہی میں نوجوانوں (نوجوان، ابھرتے ہوئے اور ہمہ جہت مصنفین (YUVA, Young, Upcoming and Versatile Authors) کے لیے وزیراعظم مینٹر شپ اسکیم اصحاب قلم کی ایک نئی نسل کی تشکیل کے ذریعے ہندوستان اور باہر کے عام قارئین کے سامنے قومی امنگوں کو پیش کرنے میں سنگ میل ثابت ہوگی۔

بلاشبہ لکھنا ایک آرٹ ہے، لیکن لکھنے کا فن بھی ایک ہنر ہے۔

اسے بالکل صحیح وقت پر صحیح سمت میں، اصلاح اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مستقبل کے اصحاب قلم کا اندرونی اضطراب اور بھی زیادہ کارآمد طریقے سے صحیح سمت و جہت حاصل کر سکے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ تحریر کے بارے میں سب سے شاندار تضاد یہ ہے کہ کوئی شخص کچھ اظہار کرنے کے لیے ان لفظوں کے استعمال کی کوشش کرتا ہے جنھیں وہ الفاظ خود ہی پوری طرح سے اظہار نہیں کر پاتے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ تحریر و تخلیق صرف الفاظ اور قواعد کی ہی ترتیب نہیں ہے، بلکہ جذباتی وسائل اسے سنوارتے ہیں، جو کسی خیال یا اسٹوری لائن کو بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ ایک مصنف کی حیثیت سے اس اسکیم سے وابستہ ہونے پر میں بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں اور حکومت ہند کے وزیر تعلیم ہونے کے ناطے میں اسے ایک کامیاب منصوبہ بنانے میں پوری ایمانداری سے پابند عہد ہوں۔

درحقیقت یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ اسکیم نہ صرف نوجوان قلمکاروں کے لیے ایک پلیٹ فارم تیار کرنے سے متعلق ہے، بلکہ اس اہم کردار کے سلسلے میں ہے جسے وہ ہماری معاشرتی، ثقافتی اور فکری زندگی میں نبھاتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جو اپنے تخلیق کاروں کو جگہ اور پلیٹ فارم، یہاں تک کہ اسکالرشپ اور رائلٹی کی شکل میں مختتانہ سے متعلق فائدہ پہنچانے کا خواہشمند ہو، یقیناً وہ سماج اپنے ثقافتی اور ادبی ورثے کا احترام کرتا ہے۔ اگر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا (مرکزی وزارت تعلیم کے تحت سرگرم کار) جیسا کوئی قومی ادارہ ان 75 نوجوان مصنّفین کی تحریروں کی اشاعت و ترویج کرے گا تو یہ آنے والے وقت میں نہ صرف ان 75 نوجوان مصنّفین، بلکہ قلمکاروں اور دانشوروں کی ایک پوری کہکشاں کو متاثر کرے گا۔

یہ لکھے بغیر بات ادھوری رہے گی کہ مصنّفین کی ایک قومی مینٹر شپ اسکیم سبھی اہم ہندوستانی زبانوں کے اصحاب قلم کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرانے پر زور دیتے ہوئے یقین دلاتی ہے کہ کثیر لسانی تانے بانے والا یہ ملک مستقبل کے اپنے قلمکاروں کو قابل قدر بصیرت فراہم کرے گا۔ ایسی بصیرت، جس کے بارے میں کسی خاص زبان سے وابستہ مصنف کے فہم و ادراک کی خاکہ گری میں ایک طویل عرصہ لگ جاتا ہے۔

نوجوان اصحابِ قلم میں ملک کے کثیر لسانی تانے بانے کے بارے میں صحیح تفہیم اور نقطۂ نظر ان میں ہندوستان کی پیچیدہ حقیقت اور متنوع الابعاد زاویوں کی مزید بہتر تفہیم فراہم کر سکتا ہے اور جو اس ملک کے ثقافتی اور ادبی ورثے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس تناظر میں، یہ قومی تعلیمی پالیسی، 2020 کے مجموعی نقطۂ نظر کے ساتھ مل جاتا ہے، جو اس کثیر لسانیت اور تنقیدی اور تخلیقی فکر پر زور دیتی ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ خالی صفحات سے ایک صاحبِ قلم پیدا نہیں ہوسکتا، لیکن یقینی طور پر غلط لکھے ہوئے صفحات سے ایک صاحب قلم کی تخلیق کی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم میں سے کئی لوگ کہانی سنانے کی خواہش رکھتے ہیں، بھلے وہ آپ بیتی ہو یا جگ بیتی یا اس کا تعلق اس سماج سے ہو جس میں ہم رہتے ہیں، یا ہمارے ماضی سے متعلق ہو۔

'یووا' کے لیے وزیراعظم کی مینٹر شپ اسکیم 30 سال سے نیچے کے مستقبل کے قلمکاروں کو یہ نادر و نایاب موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا گہرا مطالعہ کریں، اور ان واقعات و سانحات میں پوشیدہ گوہر آبدار باہر لائیں جو اب تک مخفی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں ایسے کچھ انجان یا نامعلوم ہیروز کو جوڑ سکتے ہیں جنھوں نے ملک کے کسی دور دراز کے علاقے میں رہ کر اپنی سطح پر ایسا اہم کردار ادا کیا ہو جو قومی شعور میں اب بھی زندہ ہو اور جنھوں نے ملک کی آزادی میں اپنا بیش قیمت تعاون دیا ہو، یا کسی ثقافتی لہر یا عروج کو جوڑ سکتے ہیں یا نوآبادیات کے اس دور میں معاشرتی-ثقافتی شناخت کو تلاش کرنے میں اس وسیع جوش و خروش کے اظہار کے طور پر سائنسی بصیرت سے وابستہ کسی بھی واقعے سے جوڑ سکتے ہیں۔

چونکہ ہم سب سال 2022 میں ہندوستان کی آزادی کے 75 ویں جشن کی طرف بڑھ رہے ہیں، سب سے اچھا تحفہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے معاشرے کو ہندوستان کی قومی تحریک کے اب تک کے انجان پہلوؤں کو یاد کریں اور ان کی دستاویز سازی کے توسط سے ایک موافق ماحول مہیا کریں، اور اس عمل میں قلمکاروں کی ایک نئی نسل کو تیار کریں، جو معاشرے کو سمت دینے والے 'اصحاب فکر' بن سکیں، ہندوستان کے ثقافتی اور ادبی ورثے کے سفیر بن سکیں اور اس طرح ملک کی تعمیر میں اپنا طویل مدتی تعاون دے سکیں۔ یہ ہمارے محترم وزیراعظم کے قول ''مطالعے سے بڑھ کر کوئی چیز لذت بخش نہیں اور علم سے بڑی کوئی طاقت نہیں۔'' کو صحیح معنوں میں ایک حقیقت بنائے گا۔

(**ترجمہ**: شمس اقبال، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا)

□□□

ظفر الاسلام

بانو طاہرہ سعید کی افسانہ نگاری

بانو طاہرہ سعید ایک ایرانی نژاد خاتون تھیں ان کی پیدائش 1920 میں تاج محل کے شہر' آگرہ' میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سعید امیر علی معصومی تھا جو حصول تعلیم کی غرض سے یوروپ گئے تھے مگر تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی وطن ایران جانے کے بجائے ہندوستان آگئے اور یہیں پر ملازمت اختیار کرلی۔ پہلے وہ بنگال میں قانون کے پروفیسر رہے بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ان کی جب تک ملازمت رہی وہ اپنے اہل وعیال کے ہمراہ ہندوستان میں مقیم رہے اس طرح بانو طاہرہ سعید کی زندگی کا زیادہ تر وقت ہندوستان ہی میں بسر ہوا۔ طاہرہ سعید کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے ایزابیلا تھوبرن کالج میں ہوئی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے انھوں نے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ گھر کا ماحول فارسی زدہ تھا لیکن اپنی دلچسپی کے باعث انھوں نے عربی، فارسی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی کافی دسترس حاصل کرلی تھی۔ ہندوستان میں رہنے کا ایک اثر ان پر یہ ہوا کہ انھیں اردو زبان وادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی لہٰذا انھوں نے اس زبان کے ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اردو زبان میں نظمیں اور افسانے لکھنے لگیں۔

والد گرامی کے ملازمت سے سبک دوشی کے بعد طاہرہ سعید ان کے ہمراہ آبائی وطن ایران کے شہر تہران چلی گئیں۔ ایران جانے کے بعد بھی ان کا اردو سے لگاؤ کم نہ ہوا بلکہ وہ مسلسل اردو زبان وادب کی آبیاری میں سرگرداں رہیں۔ ایران میں انھوں نے صحافت کا کورس مکمل کیا اور ریڈیو تہران کے شعبۂ اردو کی نگراں و منتظم مقرر ہوگئیں۔ انھوں نے بی۔بی۔سی سے صحافت کی ٹریننگ بھی حاصل کی۔ تہران ریڈیو کی ملازمت کے دوران وہ اپنی آواز میں اردو افسانے اور کہانیاں پیش کرتی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ ہندوستانی افواج کا پروگرام بھی نشر کیا کرتی تھیں۔ جنگ کے اختتام کے بعد ان کی شادی میجر بی۔ایم سعید سے ہوگئی جو کہ ہندوستانی فوج کے برگیڈیر جنرل کے عہدے پر فائض تھے۔ ان کی قسمت میں ہندوستان ہی

کی مٹی میں سمانا لکھا تھا چناں چہ شادی کے بعد وہ پھر سے ہندوستان واپس آ گئیں اور نظاموں کے شہر حیدرآباد میں مکمل سکونت اختیار کرلی۔ ''اے سر زمین ہند مجھے تجھ سے پیار ہے'' ہمیشہ ان کا نعرہ رہا۔ ان کی زندگی کا قیمتی ماہ وسال حیدرآباد میں بسر ہوا۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ ان کی پہلی کتاب ''ہدیۂ طاہرہ'' نعت رسول اور اہل بیت سے متعلق نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانے، مضامین، انشائیے، غزلیں اور دیگر تخلیقات ہندوستان و ایران کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی شعر کہتی تھیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے اور نثری کتابیں فارسی اور انگریزی زبانوں میں ترجمے ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ متعدد مختصر اور طویل افسانے اردو سے فارسی اور تلگو زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں۔ ان کی ایک انگریزی نظم دنیا کی پچاس بہترین انگریزی نظموں کے مجموعے میں شامل ہے۔ ان کی تخلیق شدہ بعض انگریزی نظمیں کامن ویلتھ پوسٹ گریجویٹ کورس میں بھی داخل کی گئی ہیں۔ طاہرہ سعید کی ادبی شخصیت کے متعلق 'محی الدین قادری زور' کا ایک اقتباس نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

''بانو طاہرہ سعید صاحبہ کو حیدرآباد کے چمنستان ادب میں گل صد برگ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اردو فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر ادیبانہ دسترس رکھتی ہیں اور ایک باغ و بہار شخصیت کی مالک ہیں۔ چوں کہ فطرتاً شاعر پیدا ہوئی ہیں اس لیے اپنے مزاج کی رنگینی اور طبیعت کی شگفتگی کے باعث ہر محفل میں محبوب اور مقبول رہا کرتی ہیں۔ طاہرہ ایرانی نژاد ہیں اس لیے کبھی ایرانی طرز کا لباس زیب تن کرتی ہیں اور کبھی ہندوستانی۔ مگر چاہے کسی رنگ اور وضع کا لباس پہنیں ان کا انداز شاعرانہ چھپائے نہیں چھپتا۔''

(''برگ سبز''، بانو طاہرہ سعید، ص:5)

طاہرہ سعید کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بیک وقت نثر و نظم دونوں میں اپنی تخلیقات پیش کرتی تھیں۔ چوں کہ عام طور سے شاعروں کی دلچسپی فکشن کی طرف کم ہی ہوتی ہے۔ چناں چہ دکن کی مشہور محقق پروفیسر سیدہ جعفر ان کی اس خوبی کا اعتراف ان لفظوں میں کرتی ہیں:

''اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ شعر گوئی سے جنھیں طبعی مناسبت ہوتی ہے وہ نثر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں لیکن طاہرہ صاحبہ نے بیک وقت نظم و نثر دونوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اچھا ثبوت دیا ہے۔'' (''خون جگر'' بانو طاہرہ سعید، [پیش لفظ])

طاہرہ سعید کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں مختلف اعزازات و انعامات سے نوازا گیا ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے انھیں اردو زبان کی خدمات پر 1959 کے پہلے ادبی انعام کا حقدار قرار دیا۔ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی اور ملکہ فرح دیبا نے 1961 میں ادبی انعام عطا کیا۔ منسٹری آف کلچر افیئرز، قومی یکجہتی، کلا سرسوتی اور مخدوم امن ایوارڈ سے نوازی گئیں۔ انگریزی ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں انھیں امریکہ کی عالمی یونیورسٹی ''اریزونا'' سے ''ڈی لٹ'' کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس کے علاوہ عالمی اردو ایوارڈ دہلی، امتیاز میر ایوارڈ لکھنؤ، آندھرا پردیش، مغربی بنگال، بہار اور اتر پردیش کی اردو اکیڈیوں نے ان کی مختلف تصانیف پر انعامات عطا کیے ہیں۔ انھیں اٹلی، ورڈ پوئٹری سوسائٹی امریکا اور کیمبرج سے بین الاقوامی ایوارڈ بھی پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان کے 'فن اور شخصیت' پر عثمانیہ یونیورسٹی کی طالبہ ''اقبال بیگم'' صاحبہ ایم۔ فل کی ڈگری حاصل کر چکی ہیں۔ بانو طاہرہ سعید بزم سعدی کی بانی رکن تھیں اس کے علاوہ وہ مختلف سماجی، فلاحی اداروں اور تنظیموں سے منسلک تھیں۔ ان میں محفل خواتین کی معتمد عمومی، شعبۂ خواتین ادارہ ادبیات اردو، قرائت فاؤنڈیشن آف انڈیا، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، فائن آرٹس انٹرنیشنل اور ورڈ پوئٹری سوسائٹی قابل ذکر ہیں۔ بانو طاہرہ سعید کی مختلف تصانیف جو وقتاً فوقتاً منظر عام پر آئیں ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

''ہدیۂ طاہرہ''، مجموعہ نعتیہ کلام، مطبع ابراہمیہ اسٹیشن نام پلی روڈ حیدرآباد، 1957 دوسرا ایڈیشن 1958 تیسرا ایڈیشن 1974

''برگ سبز'' ناشر مکتبہ سعدی، نیو بلڈنگ اعظم نگر حیدرآباد، جنوری 1962

''آشیاں ہمارا'' (قومی نظمیں) اگست 1973

''گل خوں چکاں'' لکی فائن آرٹ پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد (واقعات کربلا پر نظمیں) 1974 دوسرا ایڈیشن 1987

''مہکتے ویرانے'' ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، نومبر 1978

''سات دوست'' بچوں کی کہانیاں، 1979

''خون جگر'' افسانوی مجموعہ، نرگس پبلیکیشنز، برگ سبز شانتی نگر حیدرآباد۔ 1980

''دور رہ کر'' نثری نظمیں، ادارہ شعر و حکمت، حیدرآباد، نومبر 1987

''دامن گلزار'' شعری مجموعہ، سوغات نظر پبلیشرز حیدرآباد، فروری 1999

''تنہا تنہا'' (اردو آزاد نظمیں اور غزلیں)

''مثبت و منفی'' (ٹاملین کی انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ)

''پینیتھ دی باؤ'' (طبع زاد انگریزی نظمیں)
''پیل روز'' (انگریزی نظمیں)
''ار پنا'' (اردو نظموں کا منظوم تلگو ترجمہ)
''پنچھی باوا'' (افسانے)
''بانوئے مصر'' (فارسی افسانے)

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے مختلف اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان میں نظم، غزل، افسانے، انشائیہ، مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی جملہ شعری و نثری اصناف پر گفتگو کرنا اس مختصر سے مضمون میں تو ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں ان کے چند افسانوں کا سرسری طور پر جائزہ لیا جارہا ہے تاکہ ان کی فنی اور تخلیقی خوبیوں کا کچھ حد تک اندازہ لگایا جاسکے اور ہم ان کی اہمیت سے آگاہ ہوسکیں۔ طاہرہ سعید کے افسانوں میں 'خون جگر'، وردُ العرب (عرب کا گلاب)'، 'ابن آدم'، 'پسلی کا جوڑا'، 'احسان'، 'خاتون مصر' اور 'آغا باجی' وغیرہ اہم ہیں۔ سماج کے پسماندہ طبقات سے ہمدردی، احترام آدمیت، انسان دوستی اور بھائی چارگی کا جذبہ طاہرہ سعید کی کہانیوں کے خاص جز ہیں۔

طاہرہ سعید کی زندگی ہندوستان اور ایران میں بسر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایشیا اور یوروپ کے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کر چکی ہیں۔ چناں چہ انھوں نے وہاں کے کلچر، مذہب، رسوم ورواج اور اچھائی و برائی کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ لہٰذا ان کے افسانوں میں اس کے اثرات جا بجا نظر آتے ہیں۔ ''خون جگر'' دوسری جنگ عظیم کے پیرایے میں لکھا گیا ایک رومانی افسانہ ہے۔ اس کے اہم کردار 'معراج ہانم' اور 'سندیپ' ہیں جن کی خاموش محبت کو افسانے میں پرویا گیا ہے۔ طلعت ہانم معراج کی چچا زاد بہن ہے ان کا آبائی وطن کلکتہ ہے۔ معراج کی والدہ کا انتقال دو برس کی عمر میں ہو گیا تھا لہٰذا وہ اپنے والد ضمیر پاشا کے ہمراہ ترکی چلی گئی انھوں نے اس کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کمی نہ آنے دی۔ طلعت کے والد ظہیر بے اور راجندر ناتھ بیرسٹر کے درمیان گہرے مراسم تھے سندیپ ان کا بیٹا ہے جو تعلیم مکمل کر چکا ہے لیکن والدین کے اسرار کے باوجود نہ وہ کسی نوکری کے لیے تیار ہے نہ شادی کے لیے راضی۔ شاعری میں اس کو خوب دلچسپی ہے سال رواں اس کی کئی بہترین نظمیں وجود میں آچکی ہیں جس کی بنا پر اسے ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی انعام مبلغ پچاس ہزار روپے کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ حالاں کہ سندیپ خود کو معمولی درجے کا شاعر خیال کرتا تھا اور اپنی تخلیقات کو کسی کے روبرو پیش کرنا اسے خود نمائی معلوم ہوتا تھا لیکن اس انعام نے یہ طے کر دیا کہ سندیپ ناتجربہ کار شاعر تھا یا کسی دیوی کا ثابت قدم پجاری۔ سندیپ کو معراج سے محبت ہے لیکن اظہار عشق کی اس میں ہمت نہیں ہے۔ مصنفہ نے اس محبت کو رومانوی رنگ دینے کی بھرپور کوشش کی ہے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''بعض اوقات سندیپ معراج ہانم کی موجودگی میں بالکل گم سم سا ہو جاتا تھا وہ اپنے تصور میں اونچے اونچے میناروں والی مسجدیں تعمیر کرواتا اور کسی کو ''رانجی مسجد'' نام دیتا۔ کسی کو نذرانہ معراج سے موسوم کر دیتا، وہ اپنے لیے شاہ جہاں تصور کرتے ہوئے معراج ہانم کو ممتاز محل کے روپ میں دیکھنے لگتا تھا۔'' (خون جگر، ص:26)

معراج ہانم جس کے پاس سب کچھ تھا اتنا سب کچھ کہ جس کے ہونے سے عام طور پر لڑکیاں مغرور ہو جاتی ہیں مگر معراج ایسی بالکل نہ تھی۔ وہ نہایت ہی سادہ مزاجی سے زندگی گزار رہی تھی۔ اب تک کسی ترک نوجوان کو اس نے اپنی دوستی کے لائق نہ سمجھا تھا۔ اچانک دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور سندیپ ہندوستانی فوج میں انگریزوں کی جانب سے جنگ میں شریک ہوا۔ ترکی جو کہ جرمنی کا حامی تھا اور انگریزوں کی مخالفت میں جنگ لڑ رہا تھا، معراج ہانم ترکی کی طرف سے جنگ میں کود پڑی۔ لہٰذا دو مخالف فریقین کے دو معصوم دل ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک آگئے تھے جہاں دوستی اور دشمنی کا امتیاز باقی نہیں رہ گیا تھا۔

طاہرہ سعید نے اس کہانی میں کردار کی زبانی عوام تک اپنے پیغامات بھی پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک پردہ کی کیا حقیقت و اہمیت ہے اور پردے کے کیا معنی و مفہوم ہیں اس خیال کو وہ قارئین تک اس طرح پیش کرتی ہیں کہ معراج کے والد ضمیر پاشا اپنی بیٹی کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بیٹی جسم پر ایک چادر منڈھ لینے کا نام پردہ نہیں۔ اسلامی نظام تمدن کا معیار کچھ اور ہے۔ اس تمدن نے عورتوں سے بے انصافی کرنا کہیں نہیں سکھایا۔ پردہ صرف عورتوں ہی کے لیے نہیں نازل ہوا بلکہ مرد اور عورت دونوں کے واسطے پردہ کا حکم اسلام میں یکساں و مساوی ہے۔ پردہ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی روح کو انسان آلائشوں سے پاک کرے۔ نگاہ معصوم ہو اور دل روشن، جسم کی نمائش سے احتراز۔ بس اصل حجاب یہی ہے۔ برقعہ اور نقاب تو خیر ظاہری ڈھکوسلے ہیں۔''

(''خون جگر''، ص:21)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ طاہرہ سعید کو مختلف ممالک کی

سیاحت کا موقع ملا لہٰذا ان کے افسانوں میں بغداد، ایران، ترکی، روم، دمشق اور عرب وغیرہ کی جھلکیاں اور وہاں کی تہذیب وثقافت کا عکس نظر آتا ہے۔ افسانہ ''پسلی کا جوڑا'' میں دمشق کے ایک ایسے ہسپتال کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کا ماحول نہایت خوش نما و دلفریب تھا اور وہاں کے ڈاکٹر بھی بہت مشہور تھے۔ افسانے کا اصل کردار ''فتیحہ'' ہے۔ ایک غیر معمولی قسم کا بخار اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ لہٰذا اس کے والد خلیل الفواد نے اسے دارالشفاء میں شریک کر دیا تھا۔ فتیحہ پر جب تیز بخار کا غلبہ ہوتا تو وہ ہذیان بکنا شروع کر دیتی تھی۔ تیز بخار کی حالت میں جب وہ بڑبڑاتی تو اپنے محبوب انیس کو پکارتی اس وقت نرس (یعنی راوی) کو افسانوی کیفیات کا احساس ہوتا۔ فتیحہ ٹریننگ کورس مکمل کر کے ملازمت کی خواہاں تھی لیکن اس کے والدین اس کے لیے راضی نہ تھے۔ راوی خود ہی کہانی کا ایک کردار ہے اور اسی کی زبانی کہانی آگے بڑھتی ہے راوی کہتی ہے:

''فتیحہ میرے ان بیماروں میں سے ایک تھی جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یوں تو بحیثیت نرس مجھے ہر اس بیمار سے دلچسپی ہو جاتی تھی جس کی دیکھ بھال میرے سپرد ہوتی تھی۔ بیماروں سے مجھے فطری طور پر ہمدردی تھی اس لیے میں نے اس پیشے کا انتخاب کیا تھا۔

(پسلی کا جوڑا''، مشمولہ خون جگر، ص:100)

بیماری کی حالت میں مریضہ کو چٹکاری چیزیں کھانے کا دل کرتا تو وہ نرس سے خوب منت سماجت کرتی اور کہتی کہ آپا جان اچھی سسٹر چرا کے ذرا سا زیتون کا اچار چکھوا دو۔ ان پرہیزی غذاؤں سے میرا دل بالکل اکتا گیا ہے۔

بانو طاہرہ سعید کا سماجی شعور بیدار ہے، معاشرے میں پھیلی ہوئی اچھائی اور برائی کو نہ صرف وہ محسوس کرتی ہیں بلکہ اسے اپنی تخلیقات کے ذریعہ قارئین کے سامنے لاتی ہیں۔ ایک ادیب و شاعر ہونے کے علاوہ انھوں نے ایک کنڈر گارٹن اسکول بھی قائم کیا تھا اور وہ اس کی سرپرست تھیں۔ ان کے نزدیک خواتین اور لڑکیوں کو ملازمت کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے وہ ان کی حمایت کرتی ہیں۔ عام طور سے صنف نازک کو کن پیشوں میں دلچسپی لینی چاہیے اس خیال کی ترجمانی افسانے کے اس اقتباس میں ملاحظہ کریں جو دراصل طاہرہ سعید کے دل کی آواز ہے:

''میری والدہ میری معلّمی کی خواہ مخواہ مخالفت کرتی رہتی ہیں۔ آپ واقف ہوں گی کہ ہمارا زنانہ اسکول کتنا بلند معیار ہے۔ پرنسپل صاحبہ تو لاکھوں میں ایک ہیں، آخر عورت کے واسطے قوتِ بازو سے آمدنی حاصل کرنا ایسی کون سی بُری بات ہے۔ میں تو اس بات کو قابل فخر سمجھتی ہوں کہ انسان اپنی لیاقت یا صنعت سے کمائی کر سکے۔ لڑکیاں اگر معلّمی اور نرسنگ سے دلچسپی لیں تو نہایت مناسب ہے۔ معلّمی اور نرسنگ عورتوں کے لیے نہایت موزوں پیشے ہیں۔''

(''پسلی کا جوڑا''، مشمولہ، خون جگر، ص105)

اس مجموعے کا ایک افسانہ وردالعرب (عرب کا گلاب) ہے۔ یہ بالکل داستانی رنگ میں رنگا ہوا افسانہ ہے۔ اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم داستان الف لیلہ کا کوئی قصہ پڑھ رہے ہیں جس میں دمشق عرب اور ایران کا ذکر کیا گیا ہے۔ افسانے میں مافوق الفطرت عناصر کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ یہ ایک بیانیہ افسانہ ہے اس کی پوری کہانی واحد متکلم میں بیان کی گئی ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ بغداد میں ایک پرانا محل آسیب زدہ کہلاتا تھا۔ اس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ جو شخص تین متواتر راتیں تنہا اس محل کے مینار میں سوئے گا اسے تیسری رات امیر کی خوبصورت لڑکی دکھائی دے گی اور وہ اسے اپنے ہمراہ تہ خانے میں لے جائے گی۔ عام طور سے کسی کو اس کام کی جرأت نہ ہوتی تھی مگر عرب کے ایک نوجوان یوسف الکافی نے اس کی ہمت کی تھی لیکن چوتھی صبح کو وہ بالکل دیوانہ ہو کر باہر نکلا تھا۔ یہ واقعہ جتنا دہشت انگیز تھا اتنا ہی دلچسپ بھی۔

بغداد کے اکثر قہوہ خانوں پر اس محل کے مینار سے متعلق گفت وشنید ہوتی رہتی تھیں۔ ایک روز اصفہان کے ایک تاجر کے بیٹے جمشید کا ادھر سے گزر ہوا جو بغداد سے ایران جا رہا تھا۔ یہ واقعہ سن کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور یہ عہد کر لیا کہ وہ اس محل کے مینار میں تین راتیں ضرور گزارے گا۔ کچھ لوگوں نے اس کو اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ رکا۔

جمشید دو راتوں تک مینار میں تنہا سو کر ہنستا ہوا باہر نکلا۔ ایک بڑھیا نے یہ بھی کہا کہ تیسری رات ساری حقیقت بے نقاب ہو جائے گی اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ جب تیسری رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو اچانک مینار کے زینوں سے کسی کی آہٹ محسوس ہوئی پھر تو جمشید کی نیند غائب ہو گئی۔ اس کے باوجود اس نے ہمت سے کام لیا۔ چند لمحوں کے بعد اسے اپنے پاؤں کے پاس ایک حسین و نازک لڑکی نظر آئی جس کے پاؤں زمین سے معلق تھے۔ پہلے پہل تو جمشید ڈرا لیکن پھر ہمت کر کے اس نے لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اس نے اس کو یوں مخاطب کیا:

''مجھ سے نہ ڈرو اے نوجوان! میں تمہیں اذیت نہیں پہنچاؤں گی۔ مجھ سے نہ ڈرو۔ نہ ڈرو۔''

لڑکی کی آواز سن کر جمشید کا خوف بالکل ختم ہو گیا اور وہ ڈرنے کے بجائے اس سے اور زیادہ مبہوت ہو گیا۔ لڑکی نے پھر نوجوان سے کہا ''اٹھو اور میرے ساتھ تہ خانہ میں چلو۔ ڈرو مت۔''

وہ جمشید کو لے کر تہ خانے میں گئی جہاں سنگ مرمر کی کرسیاں اور تخت بچھے ہوئے تھے۔ عجیب وغریب روشنی سے پورا تہ خانہ منور تھا۔ اس نے جمشید کو تخت پر بیٹھا دیا اور خود وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد جمشید نے اس حسین لڑکی سے سوال کیا کہ تم کون ہو؟

لڑکی نے بتایا کہ میں امیر اسداللہ کی ناز پروردہ بیٹی عذرہ ہوں مجھے لوگ ''عرب کا گلاب'' بھی کہتے تھے۔ میرا رشتہ بچپن ہی میں شاہی خاندان کے ایک لڑکے حمیداللہ سے طے ہو گیا تھا۔ جو کہ دادی کا رشتہ دار تھا، حمید حسین تھا اس کے باوجود میرے دل میں اس کے لیے محبت کا جذبہ پیدا نہ ہوسکا۔ اس کے برخلاف مجھے احمد سے عشق تھا۔ وہ عرب فوج میں ایک عہدہ دار تھا اور اس کی بہن میری سہیلی تھی۔

جب عذرا اٹھارہ برس کی ہوئی تو حمید کے گھر والوں نے شادی کا تقاضہ شروع کر دیا۔ اس کے بعد دونوں جانب سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس خبر سے احمد افسردہ تھا اور وہ عذرا کو بھول جانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگا۔ ادھر عذرا کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو وہ ٹہلتی ہوئی فوارے کے پاس جا بیٹھی۔ اچانک احمد ادھر سے جاتا ہوا نظر آیا۔ عذرا نے احمد کو اپنے پاس بلایا اور خوب آہ وزاری کرنے لگی۔ احمد نے عذرا کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ میں شاہی خاندان کا نمک خوار ہوں۔ تمہارا منگیتر حمیداللہ اعلیٰ حضرت کا قریبی ہے وہ ہر اعتبار سے قابل فخر نوجوان ہے وہ تمہارا بہترین ساتھی ہوگا عذرا۔ اس کے بعد عذرا اور احمد نے محبت اور جدائی کی باتیں کیں۔ جاتے وقت عذرا نے احمد کے جڑاؤ والے خنجر کو بطور یادگار لے لیا۔ شادی کے دن جب سہیلیوں اور ہمجولیوں نے عذرا کو قیمتی لباس عروسی سے آراستہ کیا تو اچانک اس کی طبیعت بگڑنے لگی اس نے کہا مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے اور تنہائی کا سہارا لے کر اس نے احمد کے مرصع خنجر کو اپنے قلب میں اتار لیا۔ اس واقعہ کے سننے کے بعد جمشید راتوں رات اس محل سے نکل کر بغداد سے باہر آ گیا۔ وطن پہنچ کر اس کا ہوش وحواس تو درست تھا لیکن پراسرار طریقہ سے اس کا دل وردالعرب سے وابستہ ہو چکا تھا۔ وہ اکثر نیند میں بڑبڑاتا۔ ''وردالعرب، آہ وردالعرب''

''احساس'' میں سلیمہ نامی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے وہ گریجویٹ ہے اور اس کی نظر میں اپنے پاؤں پر کھڑی عورت زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے۔ اس کے والد ایک پروفیسر ہیں اور اسے اپنا ہمسفر چننے کی آزادی ہے۔ سلیمہ کی ملاقات ڈاکٹر شریف سے دہلی سے حیدرآباد جانے کے دوران ٹرین میں ہوئی اور غلطی سے سلیمہ کا بیگ ڈاکٹر شریف کے سامانوں کے ساتھ چلا گیا جس کی اطلاع شریف نے سلمہ کو خط کے ذریعہ دی۔ اس طرح دونوں کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوا اور آہستہ آہستہ یہ تعلق محبت میں تبدیل ہو گیا۔

''خاتون مصر'' کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار مصر کی سیاحت کے لیے گئی ہیں اور وہیں پر یہ واقعہ پیش آیا ہو۔ دریائے نیل کے کنارے ایک مصری نوجوان شاعر ''ہاشم'' سے افسانہ نگار کی ملاقات ہوئی جو اپنے وطن کی محبت میں عربی گیت گا رہا تھا۔ بات چیت کے بعد دونوں میں دوستی ہو گئی باتوں باتوں میں افسانہ نگار نے شاعر سے کوئی کہانی سنانے کی فرمائش کر دی۔ لہٰذا شاعر نے ''ارشد اور سلمیٰ'' کی داستان محبت بیان کی۔ یہ ایک رومانی قسم کا افسانہ ہے، ارشد جو کہ اسلامی سپاہی تھا جنگ میں شہید ہو گیا اس کی شہادت کے بعد اس کی بیوہ بیوی 'سلمیٰ' کو خاتون مصر کا خطاب عطا کیا جاتا ہے۔ سلمیٰ خود کو بیوہ نہیں بلکہ دائمی سہاگن خیال کرتی ہے۔ وہ خطاب حاصل کرنے کے لیے دلہن کی طرح سج دھج کر اسٹیج پر پہنچتی ہے اور دردناک تقریر کرتی ہے۔ سلمیٰ کو اپنے شوہر کی شہادت کا افسوس نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کے لیے شہید ہونے پر فخر محسوس کرتی ہے چند سطور ملاحظہ کریں:

''سلمیٰ آج بہت مسرور ہے وہ ایک شہید کی دلہن ہے اور اس لیے آج اس نے دلہنوں کا فاخرہ لباس پہنا ہے۔ کیوں کہ اس کا شوہر شہید ہے اور شہید کی زندگی لافانی ہے۔ اس لیے سلمیٰ ایک دائمی سہاگن ہے۔''

(خاتون مصر، مشمولہ خون جگر، ص 132)

''آغا باجی'' ہی اس نام کے افسانے کا اہم کردار ہیں۔ ان کے اندر پیسے کی ہوس بہت زیادہ ہے۔ میاں بیوی کے درمیان معمولی نوک جھونک سے افسانے میں دلچسپی پیدا کی گئی ہے۔ آغا باجی ہر دن نئی نئی فرمائشیں کیا کرتیں جن کے پوری نہ ہونے پر وہ شوہر پر تعن وتشنیع کرتی تھیں۔ اگر شوہر کسی بے جا چیز کے لیے منع کرتا ہے تو وہ اسے دقیانوسی خیالات کا حامی قرار دیتیں۔ انھیں مغرب کی ہر چیز سے لگاؤ تھا لیکن شوہر کو ان کا یہ رویہ بالکل پسند نہ تھا لہٰذا وہ کہتا ہے:

''یہ ہماری دماغی غلامی ہے کہ ہمیں اپنی ہر رسم بیہودہ، ہر نئی چیز مضحکہ خیز اور یوروپین ملکوں کی خرافات قابل تقلید نظر آتی ہے!

خدا رحم کرے اس گروہ پر۔ (آغا باجی، مشمولہ خون جگر، ص:38)

آغا باجی نے زبردستی اپنے شوہر علی قلی سے خلع لے لیا اور ایک عاشق پرست شخص مشہدی حسن سے نکاح کیا۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد اس نے آغا باجی کو تنگ کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ طلاق کے بعد آغا باجی کو علی قلی کی بے لوث محبت یاد آنے لگی اور سابقہ شوہر کی سچی محبت کا اندازہ ہوا۔ آخر کار بھابھی کی مدد سے وہ دوبارہ علی قلی کے نکاح میں آ گئیں۔ افسانے میں طاہرہ سعید نے عورت ذات کی بے وفائی اور مرد کی وفاداری کو موضوع بنایا ہے جو کہ ایک خاتون نثر نگار کی اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔

طاہرہ سعید کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی زبان صاف اور بامعنی ہے اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں کسی قسم کی دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ انھوں نے بعض کہانیوں میں موقع کی مناسبت سے ہندوستانی محاوروں کا بھی برمحل استعمال کیا ہے۔ چند محاورے ملاحظہ کریں:

''ناؤ کے مسافر بار بار نہیں ملتے، ناک پر غصہ، بوڑھے منہ مہاسے جگ ہنسائی کا باعث ہوتے ہیں، سٹی گم ہوگئی، لکھے نہ پڑھے نام ملاّ فاضل، جلے دل کے پھپھولے پھوڑا کرتے ہیں، طوطا چشمی، جوتیوں میں دال بٹا کرتی ہیں''۔

طاہرہ سعید فطرتاً شاعرہ ہیں انھوں نے اپنے بعض افسانوں میں بالکل شاعرانہ طرز کی زبان استعال کی ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں ''تم نہ روٹھو چاہے سارا زمانہ روٹھ جائے۔'' اور ''ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں۔'' اپنے افسانوں میں انھوں نے جس خوبصورتی سے محاوروں کا استعمال کیا ہے اس سے ہم ان کے وسیع مطالعہ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ طاہرہ سعید کے بیش تر کردار غیر ملکی ہیں اور وہ ان کے نام اسی مناسبت سے استعمال کرتی ہیں مثلاً معراج خانم، خلیل الفواد، یوسف الکافی، امیر اسد اللہ، حمید اللہ، علی قلی اور فتحہ وغیرہ۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ طاہرہ سعید اردو کی بہترین افسانہ نگار ہیں۔ بلاشبہ ان کی پزیرائی ہونی چاہیے۔ انھیں ہندوستان اور دیگر ملکوں سے مختلف انعامات سے نوازا جانا بھی اس بات کی دلیل ہے۔ کسی بھی ادیب کی محنت کو سراہے جانے سے ہی اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ طاہرہ سعید کا فن اور انداز بیان عام تخلیق کاروں سے بالکل مختلف ہے وہ حقیقت میں ایک آرٹسٹ ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تعلق قدیم مکتب خیال سے ہے۔ ان کے یہاں مذہب، قومیت اور رسم و رواج کی دیواریں بے معنی نظر آتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ انسانیت سے محبت ایسی مضبوط زنجیر ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی اور یہی سب سے بڑا مذہب ہے۔ ان کا خون خالص مشرقی ہے مشرقی ملکوں کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہے اور وہ مشرقی خاتون ہونے پر فخر محسوس کرتی ہیں۔

بانو طاہرہ سعید نے طویل عمر پائی ان کا انتقال 17 / اگست 2001 کو حیدرآباد میں ہوا۔ انتقال کے بعد 26 / اگست 2001 کو شعبۂ خواتین ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں پدم شری شریف النسا بیگم، پروفیسر رفیق فاطمہ، ڈاکٹر زینب حیدر، پروفیسر مغنی تبسم، باجی جمال النساء اور ذکیہ عادل وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ اجلاس میں کہا گیا کہ بانو طاہرہ سعید ایک مخلص، ہم درد، ملنسار اور دردمند دل رکھنے والی صاحب قلم خاتون تھیں۔ اخلاقی اقدار کو وہ سرمایۂ حیات سمجھتی تھیں۔ وہ ایرانی نسل تھیں لیکن حیدرآبادی تہذیب کی دلدادہ تھیں۔ ادارۂ ادبیات اردو سے ان کی وابستگی ناقابل فراموش ہے۔ ''ہماری زبان'' نئی دہلی میں ان کے انتقال کی خبر شائع کی گئی۔ ملاحظہ کریں:

''اردو فارسی اور انگریزی کی ممتاز شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کا مختصر علالت کے بعد 17 / اگست 2001 کو صبح پانچ بجے کے قریب انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۸۰ برس سے زائد تھی۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید بریگیڈیر سعید (مرحوم) کی شریک حیات تھیں۔ چالیس برس سے وہ حیدرآباد کی اردو شعری ادبی اور علمی اداروں اور انجمنوں کے خاص جلسوں و مشاعروں میں شرکت کرتی تھیں۔ ان کا کلام ملک و بیرون ملک کے ادبی رسائل میں اکثر و بیشتر شائع ہوتا رہا ہے۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی سولہ کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ ''دامن گلزار'' (مجموعہ کلام) آخری کتاب تھی۔

(''ہماری زبان'' نئی دہلی، 15 تا 21 ستمبر 2001)

□□□

Mr.Zafrul Islam

Vill Karimuddinpur

Post Ghosi

Distt. Mau- 275304(U.P)

Mb.9336239933

E-mail.zafar.ghosi@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

یہ جو رنگین تبسم کی ادا ہے مجھ میں
مجھ کو لگتا ہے کوئی میرے سوا ہے دل میں

ایک خوشبو ابھرتی ہے نفس سے میرے
ہو نہ ہو آج کوئی آن بسا ہے دل میں

مسعودہ حیات

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

میں گھر کی روشنی ہوں مجھے محفلوں سے کیا
چہروں کے مے کدے میں نہ دینا صدا مجھے

کشور ناہید

کس قدر وابستہ ان سے ہو گئی ہے زندگی
ہر صدائے دل پہ ان کے نام کا دھوکہ ہوا

یاد کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے اس طرح
بس نظر کے سامنے وہ ایک ہی چہرہ رہا

صدیقہ شبنم

ہم نے وفا نبھائی بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنے ہی بل پہ زندہ رہے عمر کٹ گئی

ہم اپنے غم کا بوجھ تو خود ہی اٹھائیں گے
اس شہر خوش سواد میں ہم راز کون ہے

نور جہاں ثروت

لطیف جذبۂ دل عشق کی امانت ہے
زمانہ بیت گیا آپ کو بھلا نہ سکے

شہر کی بھیڑ میں آنکھیں جسے کھو دیتی ہیں
دل کے آنگن میں وہی شخص کھڑا ہوتا ہے

مظفر النساء ناز

دل ہے آتش کدہ محبت میں
اب طبیعت میں اعتدال کہاں

دل کی ویرانیاں خدا کی پناہ
چاند مدھم ہے آسماں خاموش

اسما سعیدی

ریگ زارِ خیال سے ہو کر
دل میں چپکے سے آ گیا کوئی

دل کسی بات میں نہیں لگتا
جانے کیا بات کہہ گیا کوئی

سیما نظمی

میں اکیلی کھڑی ہوں کب سے یہاں
تم تو ساری دشائیں بھول گئے

تو نے ورثے میں کیا دیا مجھ کو
پتے پتے پہ نام تیرا ہے

شائستہ یوسف

ڈاکٹر چمن آرا خان

خواجہ حسن نظامی کا اسلوب

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ادیب کا اپنا مخصوص اور منفرد انداز ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز اور ممیّز کرتا ہے۔ ادبی تنقید میں اچھے اور برے اسلوب کی تخصیص بھی پائی جاتی ہے۔ کامیاب اور ناکام اسلوب کی اصطلاحیں بھی مروج ہیں مثلاً سادہ، بے تکلف، موزوں، خوش آہنگ، شگفتہ، خوب صورت یا مرصّع اسلوب۔ موضوع کی بنا پر کسی شاعر یا ادیب کی انفرادیت کا اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے۔ کیونکہ موضوع خواہ کیسا ہی ہو یہ کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں ہوتا۔ اسلوب میں موضوع، خیالی اور زبان اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح اسلوب کو ہم کسی لکھنے والے کا شناس نامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بقول آل احمد سرور:

''واضح خیالی کا موزوں الفاظ اظہار ہے۔''

(نثر کا اسٹائل، از آل احمد سرور، ص48)

خواجہ حسن نظامی بیسویں صدی کے صاحب طرز اردو ادیب تھے جب اردوئے معلیٰ لال قلعہ سے لے کر فتح پور سیکری تک بولی اور سمجھی جاتی تھی اردو کا جو لب و لہجہ اس قت رائج تھا ان سب کی پرچھائیاں خواجہ صاحب کے مضامین میں ملتی ہیں۔

خواجہ صاحب کا رنگ سب سے جدا ہے، نرالا ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ان کی نثر میں آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مگر آزاد کی نثر میں تصنّع زیادہ ہے۔ خواجہ صاحب کے جملے اور فقرے بھی گرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن تصنع کو اس سے چھپایا گیا ہے کہ بے تکلفی اور بے ساختہ بھی سامنے آجاتا ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے۔ خواجہ صاحب نے تعداد کے اعتبار سے خاصی کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر اچھے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن پر ابھی تک شاید کسی نے کچھ لکھا نہ تھا۔ انھوں نے تصوف کے مسائل پر خوب لکھا۔ لیکن ان کی مشہور تخلیق ان کے روزنامچے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر لکھا۔ وہ تخیل کی مدد سے تفصیل بیان کرتے کہ حقیقی مناظر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتے۔

خواجہ صاحب کا فطری مذاق صوفیانہ ہے چنانچہ اہل معرفت کے دائرے میں ان کا مرتبہ نہایت بلند ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ معرفت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرے میں ان کو ایک خاص روحانیت نظر آتی ہے۔ ادبی چیزوں سے بھی وہ غافل انسانوں کو درس معرفت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کتاب 'سی پارۂ دل' کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس خوبی سے بے جان چیزوں جیسے لالٹین یا برف کو دیکھتے ہیں یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں اس قسم کی تصنیف کی یہ پہلی نمایاں مثال جسے انگریزی میں (Essay) کہتے ہیں یعنی تخیلی مضمون نگاری اس میں موضوع کی محض منطقی تحلیل نہیں ہوتی بلکہ ان دل فریبوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو ایک کیفیت اور حیرت پیدا

کرتی ہے اس طرزِ تحریر کا عکس اول آزاد کی کتاب ''نیرنگِ خیال'' کے بعض حصوں میں ملتا ہے۔

انشائیہ نگاری ادب کی ایک صنف ہے جس میں لکھنے والا کسی موضوع پر اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اخیر میں عدم تکمیل کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ طریقۂ استدلال بظاہر منطقی ہوتا ہے۔ زبان کی شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ خواجہ صاحب کے انشائیے اس تحریک پر کھرے اترتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے صرف عظیم موضوعات پر طبع آزمائی نہیں کی۔ انھوں نے آنسو، لیمپ، مٹی کا تیل، دیاسلائی، کھٹکہ بچکی، الو، مکھی، اوس، لالٹین، جھینگر، فٹ بال اور سوئی جیسے بے حقیقت اور نظری موضوعات پر بھی لکھا۔ ان کی تحریروں میں اول تا آخر تصوف اور روحانیت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ یہ انشائیے میں کوئی نہ کوئی نصیحت، کوئی نہ کوئی اخلاقی پند اور روحانی نکتہ پر زور ہوتا ہے۔ مچھر، مکھی، الو، سوئی، جھینگر اور جھڑکاؤ کی گاڑی اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

خواجہ صاحب نے حقیر سے حقیر موضوع پر قلم اٹھایا تو اس میں عارفانہ بصیرتیں سمودیں۔ مکھی، مٹی کا تیل، دیاسلائی اور فٹ بال بظاہر ایسی چیزیں ہیں جس پر عام نگاہیں سطحی انداز سے گزر جاتی ہیں۔ مگر انھوں نے ان میں بھی رمز کا پہلو تلاش کر لیا ہے۔ الو سے متعلق کہتے ہیں:۔

''الو سارا دن حریص پرندوں کی مثل، پیٹ کی خاطر در بدر مارا مارا نہیں پھرتا بلکہ وہ اجاڑ اور غیر آباد کھنڈروں میں نشیمن بناتا ہے۔ پہلے جہاں کوئی غیر مانوس آواز اُس کی خوبی میں خلل انداز نہ ہو۔'' (سی پارہ دل از خواجہ حسن نظامی ص 188)

خواجہ حسن نظامی مصوّرِ فطرت تھے۔ انھوں نے زندگی کے تمام مظاہر سے سروکار رکھا۔ زندگی کی تلخیوں اور شیرینی کا مزہ چکھا۔ انھوں نے حیوانات، نباتات، جمادات اور مظاہر قدرت کی اپنے انشائیوں سے زبردست عکاسی کی ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدے اور مطالعے سے لفظی تحریروں میں طرح طرح کے رنگ بھر دیے 'گلاب تمھارا کیکر ہمارا' میں انھوں نے گلاب کے پھول کے مقابلے میں کیکر کے پھول کو سراہا ہے۔ اُس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''کیکر کا پھول گلاب کے پھول سے لاکھ درجہ اچھا ہے گلاب کا پھول ایک دن کی تیز دھوپ سے کھلا اور مرجھا جاتا ہے اور کیکر کا پھول ہفتوں سورج کا مقابلہ کرتا ہے اور آجکل تعریف اُسی کی ہے جو دُشمن کے مقابلے میں زندہ وسلامت رہے۔''

(سی پارہ دل، از خواجہ حسن نظامی ص 209)

خواجہ صاحب کے انشائیوں کا سب سے بڑا حسن ان کا منفرد اور دلکش اسلوب ہے۔ بظاہر دیکھا جائے تو وہ ایک عام انسان کی زبان میں بات کرتے ہیں مگر اس میں حقیقت اور معرفت کے اسرار چھپے ہوتے ہیں۔ ان کا اسلوب بے ساختہ اسلوب ہے۔ بے ساختہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اسلوب کو برقرار رکھنے کے لیے کسی طرح کی شعوری کوشش کر رہے ہوں۔ وہ بات میں بات پیدا کر دیتے ہیں وہ الفاظ کے نبض شناس ہیں۔ وہ سیدھے سادھے جملوں میں گہری بات کہہ جاتے ہیں۔ دیاسلائی کا یا اقتباس ملاحظہ ہو:

''آپ کون ہیں؟ ناچیز تنک کر، اسمِ شریف؟ دیاسلائی کہتے ہیں۔ دولت خانہ؟ جناب دولت ہے نہ خانہ۔ اصلی گھر جنگلی ویرانہ تھا۔ مگر چند روز سے احمد آباد میں بستی بسائی ہے اور سچ پوچھیے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے۔ میرا موجودہ ٹھکانہ ہے۔''

(سی پارہ دل از خواجہ حسن نظامی ص 159)

خواجہ حسن نظامی کے دل میں انسانیت کا درد تھا۔ انھیں بدلتے ہوئے زمانے کا شعور تھا۔ ان میں سیاسی بصیرت بھی غیر معمولی تھی وہ ایک روشن خیال اور وسیع المشرف صوفی تھے۔ ان کی نظر میں سبھی انسان برابر تھے۔ ان کے انشائیوں کا خاص وصف ایجاز و اختصار ہے۔ انھوں نے چھوٹے انشائیے لکھے جو کہ ادائے خیالی اور معنویت کے اعتبار سے بھی مکمل ہیں۔ مرغ کی اذان، طائر سبز فام کا پیام وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ تصوف کے نکات خواجہ صاحب نے اپنے انشائیوں میں اس طرح بیان کیے ہیں کہ عام ذہن اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ بقول مولوی عبدالحق:

''ان مضامین میں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں وہ اپنے سے ہم کلام ہیں کہیں راز و نیاز ہے، کہیں دل درد دل کی داستان ہیں اور اپنا اور ہمارا دکھڑا رو رہے ہیں۔۔۔۔۔ کہیں تخیل کا زور عرش تک لے گیا، کہیں نثر میں شاعری کی شان دکھائی کے نظم مقفیٰ ہیچ ہے۔'' (مقدمہ سی پارے دل ص 9 تا 10)

خواجہ صاحب کے انشائیوں میں ظرافت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے جو ہمیں اکبر الہ آبادی کی یاد دلاتا ہے۔ چٹکیاں اور گدگدیاں ان کی ظرافت کے بے مثل نمونے ہیں۔ انھوں نے اپنے الفاظ سے خاص قسم کی معنویت

پیدا کی ہے۔ان کی ظرافت میں پھکڑ پن نہیں ہے اور نہ ہی طنز کی زہر خندی ہے۔ وہ مسکراتے ہیں اور دوسروں کو بھی مسکرانے کا موقع دیتے ہیں۔ جھینگر کے جنازے کا بیان دیکھیے:

> ''ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کہ کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا۔ اچھل کر بولا۔ ذرا اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ سبحان اللہ تم کیا خاک اس کا مطالعہ کرتے تھے بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔''

(سی پارہ دل از خواجہ حسن نظامی ص 299)

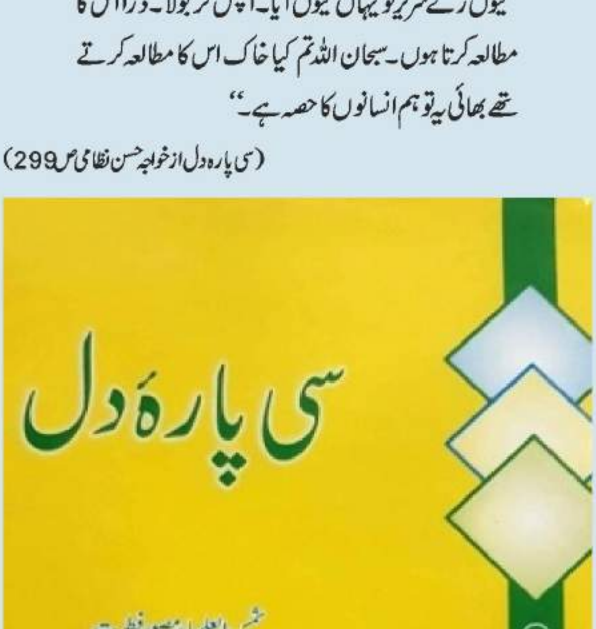

خواجہ صاحب کی تصانیف پڑھنے والوں پر ابتدا سے طرز تحریر کی دلکشی کا اثر ہونے لگتا ہے۔ان کے اسلوب بیان میں ایک خاص لذت اور تاثیر پائی جاتی ہے۔ دوسری ممتاز خوبی ان کے بیان میں سوز وگداز کا پہلو ہے، وہ جب چاہتے ہیں موقع کو دردناک بنادیے ہیں اور اس قدر دردناک کہ دل کو سنبھالنا دشوار ہوجاتا ہے۔ مثلاً تیموری شہزادوں کے دردناک حالات کو خواجہ صاحب نے ایسے لکھا ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ انسان بھی رونے لگے۔ وہ مسلمانوں کی اندوہناک حالت سے خاصے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم غم ناک مناظر بیان کرنے میں بھی کبھی نہیں تھکتا۔

خواجہ صاحب مغل تہذیب کی پامالی اور بربادی سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اس معاشرت کے بعض پہلوؤں کو مفصل طور پر پیش کیا ہے۔ درباروں میں آرائش وزیبائش کے سروسامان شہزادے اور شہزادیوں کا رہن سہن، اس معاشرت کی نفاست اور لطافت کے علاوہ دہلی کی بیگمات کی زبان کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ دہلی کی عام عورتوں کی زبان جس میں عام بول چال کے الفاظ اور محاوروں کا حسین امتزاج ہے۔ مثلاً

> ''تمھیں ہم دوبھر ہوگئے ہیں تو صاف کہہ دو ہم اپنے دادا بہادر شاہ کے پاس جارہے ہیں ان کو ہم دوبھر نہیں ہیں۔ وہ تو ہم کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں اور ہم کو ہاتھوں چھاؤں میں رکھتے ہیں۔'' (کانا باتی از خواجہ حسن نظامی ص 9)

خواجہ صاحب نے اپنی تحریروں میں مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کو زندگی بخشی۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ہندی اور اردو زبان کو ایک دوسرے سے قریب لائے۔ اردو میں سادہ اور آسان نثر کو رواج دیا۔ ان کی زبان بامحاورہ طرز بیان، اسلوب کی سلاست، دہلوی مذاق کا پتہ دیتی ہے۔ خواجہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مضامین کو ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ وہ تصوف کے دائرے سے نکل کر ادب کی حدود میں آگئے ہیں۔ انھوں نے متصوفانہ مسائل کو عالمانہ انداز میں براہ راست بیان کرنے کے بجائے تمثیل اور تجسیم کے پیرائے میں شاعرانہ لطافت اور بذلہ سنجی کے ساتھ پیش کردیا۔ مسائل تصوف کو اس خوب صورتی اور دلکشی کے ساتھ کسی اور نے بیان نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولیت اور بقا کے ضامن ان کے انشائیے میں خواجہ حسن نظامی کا پسندیدہ موضوع 1857 کے واقعات ہیں۔ انھوں نے دلی کی جاں کنی، بہادر شاہ کا روزنامہ، بہادر شاہ کا مقدمہ اور بیگمات کے آنسو' کتابیں لکھیں۔ خواجہ صاحب کے قصے تاریخی اور مذہبی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان قصوں کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھیں تاریخ سے خاصہ لگاؤ تھا یہ مغلیہ حکومت کے زوال، انحطاط اور مشاہیر اسلام پر مرتکز ہیں۔ انھوں نے موثر الفاظ میں ان کے واقعات بیان کیے ہیں جنھیں پڑھ کر رحم اور حیرت سے جذبات دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ قصے دل بہلاوے یا وقت گزاری کے لیے نہیں ہیں۔ ان قصوں میں انسان کی بدلتی ہوئی زندگی اور اس کے اختتامی مسائل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔ انھوں نے تاریخی واقعات کی کڑیوں کو باہم مربوط کردیا ہے۔ جس سے دل چسپی کا عنصر قائم رہتا ہے۔ خواجہ صاحب اپنے قصوں میں ماضی کی یاد میں اور مغلیہ حکومت کی پامالی اور بربادی پر آنسو بہاتے ہیں۔ شہزادوں اور

شہزادیوں کی زبوں حالی پر ماتم کرتے ہیں۔ان کے قصوں میں غم کی شدت کا اظہار ہے۔جس نے ان کے قصوں کو بہت پرتاثیر بنادیا ہے۔

تاریخی قصوں میں لکھنا ایک دشوار گزار اور خطروں سے بھرا ہوا عمل ہے۔اس میں تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔خواجہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخی روایت اور تصور کی بنیادوں پر کرداروں کو پیش کر کے ان قصوں میں دل چسپی کا عنصر برقرار رکھا ہے۔ دہلی کی جاں کنی میں غدر کے واقعات مفصل اور موثر انداز سے بیان کیے گئے ہیں۔مثلاً دہلی پر حملے کی تیاریاں، دہلی کی شکست، بہادر شاہ کا گرفتار ہونا، ان کے بیٹوں کا قتل، اور مسلمانوں کا مارا جانا یہ تمام واقعات پرتاثیر ہیں جسے پڑھ کر آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں۔ دہلی کی جاں کنی ''میں خواجہ صاحب نے تاریخی واقعات مستند کتابوں سے اخذ کیے ہیں اور اس کا پلاٹ بھی تاریخی واقعات کے گرد ہی گھومتا ہے۔زبان و بیان سے اس قصے میں دلچسپی کا عنصر پیدا کردیا ہے۔''بیگمات کے آنسو'' میں خواجہ صاحب نے مغلیہ خاندان کی عبرت ناک تباہی کو بیان کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے خاندان کی بیگمات' شہزادوں اور شہزادیوں کے دردناک واقعات کے علاوہ انگریزوں کے ہاتھوں ظلم وستم ان پر رواں رکھے گئے۔

خواجہ صاحب نے قصوں میں جن کرداروں کو پیش کیا ان سے وہ بخوبی واقف ہیں۔تمام قصوں کے کردار تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔خواجہ صاحب کی حیثیت یہاں ایک عام قصہ گو کی نہیں بلکہ وقائع نویس کی ہے۔ کردار جس طرح کی زبان میں باتیں کرتے ہیں اس سے ہم ان کی حیثیت، ذہنیت اور مزاج کا اندازہ لگالیتے ہیں۔یہی قصے کی اثر انگیزی اور کامیابی کا راز ہے۔مثلاً

''میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔باوجود فاقے کی ناتوانی کے انھوں نے پہلو بدل کر کہا۔تف رہے تیری غیرت میں، خیرات زکوۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اس سے مرجانا بہتر ہے۔اگر ہم مٹ گئے مگر ہماری جراءت نہیں مٹی۔میدان میں نکل کر مرجانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے۔صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔'' (بیگمات کے آنسو از خواجہ حسن نظامی ص26)

خواجہ حسن نظامی کے قصوں کا ایک معاشرتی پہلو بھی ہے۔خواجہ صاحب نے مغلیہ تہذیب کی اور معاشرت کی عکاسی بہت عمدہ کی ہے۔مثلاً درباروں کی آرائش، شہزادوں اور شہزادیوں کا رہن سہن، اور صرف دورِ عروج بلکہ دورِ زوال کے ایسے نقشے کھینچے ہیں جس سے مغل بادشاہ کی زندگی جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ان کے یہاں جو تہذیبی فضا ہے وہ کسی خیالی دنیا کی چیز نہیں یہ ایک طرح کی جیتی جاگتی تہذیبی واردات کا بیان ہے۔

''چھت میں جھاڑ فانوسوں، ہانڈیوں اور دیواروں پر قمقموں، دیوارگھڑیوں اور، چینی قندیلیاں اور گلدستوں کی آرائش ہوتی تھی۔سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگا جمنی چوبوں پر سبز ریشمی رومال ایستادہ ہوتا تھا۔اس کے نیچے مخمل کا کارچوبی مسند پیچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ، سبز رنگ کی وجہ یہ تھی کہ دہلی کے بادشاہوں کا درباری رنگ سبز تھا۔'' (کانا باتی از خواجہ حسن نظامی ص162)

خواجہ صاحب کی صحافت روایتی صحافت سے مختلف تھی۔انھوں نے اخبارات اور رسائل میں اصلاحی رجحان کو ضروری اہمیت دی۔اس کے لیے یہ اخبارات اور رسائل کسی نہ کسی مقاصد کے تحت ہی جاری کیے گئے۔ خواجہ صاحب کی صحافتی زندگی نصف صدی سے بھی زیادہ مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔ان کی سرپرستی میں متعدد اخبارات اور جرائد جیسے نظام المشائخ، پیر بھائی، درویش، گروسیوک، دین دنیا، تبلیغ نسواں، عورتوں کا اخبار، غریبوں کا اخبار، رعیت توحید اور منادی شائع ہوئے۔انگریزی میں انھوں نے نظام گزٹ، نیک مسلم اور ڈکٹیٹر جاری کروائے۔اخبارات کے علاوہ متعدد رسائل خواجہ صاحب کے حلقے سے منظر عام پر آئے۔جس میں عورتوں کا گروسیوک، سیاسی دنیا، علمی دینا اور ماہنامہ مولوی وغیرہ خاص ہیں۔خواجہ صاحب نے اخبارات اور رسائل میں اصلاحی رجحان کو ضروری اہمیت دی اسی لیے یہ اخبارات ورسائل میں ان کا طرز تحریک بھی متوازن اور معتدل ہے۔ اس میں انشائیوں والا رنگ نہیں ہے۔انھوں نے اپنے اداریوں میں روزمرہ اور محاورے کا استعمال کیا ہے اور مضامین پر لکھنے کی وضاحت اس طرح کی ہے جس میں صحافتی انداز کے ساتھ ادبیت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی دوسری کتابیں جو نیم تاریخی واقعات پر مشتمل ہیں ان میں اسلامی تاریخ سے متعلق محرم نامہ، یزید نامہ، میلاد نامہ اور طمانچہ بر رخسار یزید ہیں۔یزید نامہ اور محرم نامہ میں واقعات تاریخ طبری سے لیے گئے ہیں۔اس میں خواجہ حسن صاحب کی ذات کا کوئی دخل نہیں ہے۔محرم نامہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر خلافت تک کے واقعات موجود ہیں۔یزید نامہ میں امیر معاویہ سے لے کر مروان الحمار تک بنی امیہ کے چودہ بادشاہوں کی تاریخ، یزید اور امیر معاویہ کے ظلم وستم کی داستان بیان کی گئی ہے جس کی بنیاد مستند کتابیں ہیں۔طمانچہ بر رخسار یزید، ایک فرضی قصے پر مشتمل ہے۔اس کی تاریخی اہمیت نہیں ہے۔اس کے کردار

اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسے ڈرامے کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ اس میں حضرت امام حسینؑ کے کردار کو بڑی دل سوزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''۔۔۔ میں تین دن کا کا پیاسا ہوں اور میرے چاروں طرف پیاسی اور بے کس عورتیں رہ گئی ہیں۔ اور ایک آدمی بھی میرا مددگار نہیں ہے۔ کیا ایسے وقت میں دنیا کا کوئی آدمی اپنے حواس قائم رکھ سکتا ہے، مگر میں حسین، علی کا بیٹا، ابوطالب کا بیٹا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ، چونکہ حق پر ہوں اس واسطے میرا دل مضبوط ہے اور میں ان مصیبتوں سے کچھ بھی نہیں گھبرایا۔ آگے بڑھ اور مقابلہ کر۔''

(کانا باتی، از خواجہ حسن نظامی، ص 76)

خواجہ صاحب نے اسلامی تاریخ پر مشتمل جو قصے لکھے وہ اسلوب اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی منفرد کہے جا سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب جو تاثر قبول کرتے ہیں اسے دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے قصوں میں انھوں نے اسی کو آزمایا ہے۔

قصے کے بیان میں مرقع کشی کا عنصر خاصا اہمیت رکھتا ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ یہ قصہ جس واقعے کو بیان کرے اس کی صحیح اور سچی تصویر کشی کرے کہ وہ منظر نظروں کے سامنے گھوم جائے۔ یہ کام لفظوں کی کاریگری سے سامنے آئے۔ خواجہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تمام جزئیات کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ مرقع پیش کرتے وقت وہ اشیا کی صفات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اس سے ان کی قوت مشاہدہ کا پتہ بھی چلتا ہے۔ انھوں نے مجرد مرقع کشی خوب کی ہے۔ ہر واقعے اور ہر عمل کا اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کے سارے نقوش سامنے آجاتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

''جب میں اندر گیا تو شہزادی صاحب بوریے پر بیٹھی تھیں۔ دالان میں ایک طرف چارپائی پڑی ہوئی تھی اور ان کے سامنے ایک بوریا بچھا ہوا تھا جس پر بیٹھی ہوئی شہزادی صاحبہ پن کٹی سے پان کوٹ رہی تھیں۔

بوریا بہت پرانا تھا اور جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ پیوند لگی ہوئی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ چھوٹا تھا اور ذرا میلا تھا۔ شہزادی صاحبہ کے سامنے ایک بدھنی رکھی تھی جس میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ شہزادی صاحبہ اس سے اگالدان کا کام لیتی تھیں۔ ان کے دائیں جانب پٹاری رکھی تھی۔ جو اگرچہ بدقلعی تھی لیکن اس پر پان کے دھبے نہیں تھے۔ دالان کی کڑیاں بہت بوسیدہ تھیں۔ گلہریوں اور چوہوں نے تختوں کو خراب کر رکھا تھا۔''

(بیگمات کے آنسو از خواجہ حسن نظامی ص 25)

خواجہ حسن نظامی کے یہاں جو فلسفیانہ نکات ملتے ہیں ان سے ان کی فکری انداز کی گہرائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کی ایک اور کتاب ''کائنات بیتی'' ہے جس میں انھوں نے زمین، آسمان اور ستاروں کی کہانی بیان کی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت واضح اور گہرا تھا۔ ان کی نثر کی خوبی یہ ہے کہ وہ گہرے سے گہرے مسائل کو سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے اسلوب کی نقل کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ وہ پیچیدہ موضوعات کو بھی دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے اسلوب میں بلا کی انفرادیت پائی جاتی ہے وہ اخلاقی مسائل کو کہانیوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے جو سادہ اور شیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام کا شرف حاصل کر چکی ہے۔ ان کی نثر جا بجا تشبیہوں، استعاروں اور تمثیلوں سے کام لیتی ہے۔ خواجہ صاحب ان تمام وسائل کا استعمال کرتے ہیں جو دراصل شاعری کے وسائل ہیں۔

خواجہ صاحب کی نثر میں رعایت لفظی کا نہایت لطیف پہلو کہیں کہیں نظر آجاتا ہے جس سے عبارت میں شگفتگی اور جان آجاتی ہے۔ اسلوب بیان میں متانت اور سنجیدگی خاص طور سے نمایاں ہے اور بزرگانہ انداز تو ایسا ہے کہ تبسم مزاج کا پہلو نہیں پیدا ہونے پاتا لیکن خشکی اور پھیکے پن کی ہوا بھی دامن مضمون تک نہیں آنے پاتی۔ مضامین کی نوعیت پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ موضوع نہ تو فلسفیانہ ہے، نہ عالمانہ بلکہ روزمرہ اور کام کی باتوں پر اخلاقیات کو مدنظر رکھتے ہوئے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کی تصنیفات ایک ایسا عجیب گلدستہ ہے، جس میں ہر رنگ کے پھول ہیں اور ہر پھول میں نئی خوشبو ہے۔

□□□

Dr. Chaman Ara
Associate Professor
105 Pratap Khand
Vishwa Karma Nagar
Near Jhilmil Masjid
Vivek Vihar 2 Delhi-110095
E-mail: khancara@gmail.com
Mobile No.: +91-9821268969

ڈاکٹر وقار النساء

درسیات اور قومی تعلیمی پالیسی 2020

آزادی سے لے کر اب تک جتنی بھی تعلیمی پالیسیاں آئی ہیں سب نے تعلیم کے عمل کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کے لیے سفارشات پیش کیں ہیں۔ کسی بھی فرد، سماج اور ملک کی ترقی تعلیم کے معیار پر ہی منی ہے۔ کیونکہ تعلیم انسان کے ذہنوں کو کھولتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔

NEP-2020 میں بھی یہ بات واضح کی گئی ہے کہ کسی بھی شخص کی صلاحیتوں کو پوری طرح سے حاصل کرنے کے لیے معیاری تعلیم بہت ضروری ہے اور قومی تعلیمی پالیسی -2020 میں Global Education Agenda کی بات کی گئی ہے۔ موجودہ دور کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسی پالیسی کی ضرورت ہے جو اس اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ NEP-2020 ایک ایسی ہی پالیسی ہے۔

ہمارے ملک کی آبادی تقریباً 1.3 بلین ہے جس کا 27% حصہ تقریباً 14 سال سے کم عمر لوگوں کا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا مستقبل جو ہمارے طلباء ہیں اور ان کی تعلیم کی ذمہ داری ہماری ہے تا کہ ہم اس مستقبل کے شہریوں کو معیاری اور اعلیٰ تعلیم فراہم کر سکے۔ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہی اس قومی تعلیمی پالیسی – 2020 کو تشکیل دیا گیا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020۔MHRD نے جون 2017ء میں ڈاکٹر کے۔ کستوری رنگن کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی تا کہ قومی تعلیمی پالیسی کا خاکہ تیار کرے۔ مئی 2019ء میں کمیٹی نے قومی تعلیمی پالیسی کا خاکہ عوام کے مشوروں کے لیے پیش کیا۔ ملک بھر سے تجاویز کو خوش آمدید کہا گیا اور NEP-2020 کو 30 جولائی 2020ء کو پیش کیا گیا۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے بنیادی مقاصد:

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کا بنیادی مقصد ہمارے ملک کے تمام طبقوں کو تعلیم کے عمل میں شامل کرنا اور یکساں مساوی تعلیم دینا ہے۔

تحتانوی تعلیم کو عام کرنا اور 2025 تک تمام بچوں کو Fundamental Literacy مہیا کرنا ہے اور ہمارے ملک کو Global Knowledge Superpower بنانا ہے۔

نصاب اور قومی تعلیمی پالیسی:

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کا نظریہ ہے کہ ہمارا نصاب اور تدریسیات (Curriculum and Pedagogy) ایسا ہونا چاہیے جو طالب علموں کو بنیادی فرائض، آئینی اقدار، ملک سے محبت، شخصی ذمہ داریوں سے روشناس کرائے اور طالب علموں کو اس بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے کردار سے واقف کروائے۔

اس پالیسی کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ طلباء میں بھارتی ہونے کا جذبہ پیدا ہو اور وہ اپنے ملک پر فخر کرے۔ طلباء کے صرف خیالات ہی نہیں

بلکہ ان کے جذبات اور ذہانت کی ایسی تربیت کی جائے تا کہ وہ ایک اچھے شہری بن سکیں جو آج کے سماج کی بہت بڑی ضرورت ہے۔

نصاب سے مراد وہ تمام مشغلے اور تجربات ہیں جو طالب علم مدرسہ میں معلم کی سرپرستی میں سیکھتا ہے۔ نصاب ایک ایسا اوزار ہے جس کے ذریعہ ہم طلباء کی نشوونما کرتے ہیں اور تعلیمی مقاصد کے مطابق ہم طلباء کو تیار کر سکتے ہیں۔ تعلیم کے عمل میں نصاب ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ نصاب کی تیاری پر زور دینا وقت کی اہم ضرورت ہے تا کہ ہم بہتر سے بہتر سماج کی تشکیل کر سکیں۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی ایسے نصاب کو تیار کرنے کی بات کی گئی ہے جو طلباء کی صلاحیتوں کی شناخت کرے اور انھیں فروغ دے۔ اساتذہ اور والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلباء کی صلاحیتوں کو جانے اور اُن کی ہمہ جہت شخصیت کی نشوونما کرے۔ نصاب اس طرح ہو کہ طلباء تعلیمی میدان اور کھیل کود کے میدان دونوں میں آگے بڑھ سکے اور پالیسی میں Foundational Literacy اور Numeracy پر بھی زور دیا گیا ہے تا کہ طالب علم کو (LSRW)، سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارت حاصل ہو۔

قومی تعلیمی پالیسی-2020 میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کو الگ نا کرنے کی بات کی گئی ہے تا کہ طلباء کو اپنی شخصیت کو اُبھارنے کے مواقع مل سکے اور ہمہ جہت شخصیت کی نشوونما ہو سکے۔ اسی طرح سے پالیسی میں کہا گیا ہے کہ آرٹس اور سائنس کے مضامین میں بھی فرق نا کیا جائے۔ Vocational اور Academic میں بھی تفریق نا کی جائے جو کہ ہمارے معاشرے میں دیکھا جاتا ہے۔ پالیسی میں Life Skills کو بھی فروغ دینے کی بات کی گئی ہے جیسا کہ ترسیل Communication, Cooperation, Team Work وغیرہ جو کسی بھی طالب علم کی کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہے۔

اس لیے نصاب ایسا ہونا چاہیے جس سے Life Skills کو فروغ دیا جا سکے اور NEP-2020 میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نصاب میں Summative Assessment کے بجائے Formative Assessment پر زور دیا جائے۔

نصاب موجودہ دور کے طلباء کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہونا چاہیے۔ یعنی Technology کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ تصورات کی تفہیم پر زور دینا چاہیے۔ قومی تعلیمی پالیسی۔

'اسکولوں میں نصاب اور درس و تدریس؛ تعلیم کو جامع، مربوط و مکمل، خوشگوار اور دلچسپ ہونا چاہیے:

5+3+3+4 کے نئے ڈیزائن میں اسکول کے نصاب اور درس و تدریس کی تنظیم نو

قومی تعلیمی پالیسی-2020 کے مطابق اسکولی تعلیم کے نصاب اور تعلیمی ڈھانچے کی تنظیم نو کی جائے گی، تا کہ 3-8، 8-11، 11-14 اور 14-18 سال کی عمر کے مختلف مراحل میں طلبہ کی نشوونما کے الگ الگ احوال کے مطابق ان کی دلچسپیوں اور نشوونما کی ضرورتوں پر پوری توجہ دی جا سکے۔ اس لیے اسکولی تعلیم کے لیے نصاب، تعلیمی ڈھانچے اور نصاب کا ڈیزائن 5+3+3+4 کے ڈیزائن پر ہوگا۔ جس کے تحت بالترتیب فاؤنڈیشن اسٹیج (دو حصوں میں یعنی آنگن واڑی/ پری اسکول کے تین سال + پرائمری اسکول کے درجہ اول اور دوم میں دو سال تین سے آٹھ سال کی عمر کے بچوں سمیت)، پریپریٹری اسٹیج (درجہ سوم سے پنجم آٹھ سے گیارہ سال کی عمر کے بچوں سمیت)، مڈل اسکول اسٹیج (درجہ ششم سے ہشتم گیارہ سے چودہ سال کی عمر کے بچوں سمیت) اور سیکنڈری اسٹیج (نویں درجے سے بارہویں درجہ تک دو فیز میں یعنی پہلے فیز میں نویں اور دسویں اور دوسرے فیز میں گیارہویں اور بارہویں؛ چودہ سے اٹھارہ سال کی عمر کے بچوں سمیت) شامل ہوں گے۔

فاؤنڈیشن اسٹیج میں پانچ سالہ لچک دار، کثیر سطحی، کھیل اور سرگرمیوں پر مبنی تعلیم، ای سی سی ای کا نصاب اور درس و تدریس شامل ہوگا جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ پریپریٹری اسٹیج تین سال کا ہوگا جو فاؤنڈیشن اسٹیج کی کھیل، جستجو اور سرگرمیوں پر مبنی طریقہ تدریس سے آگے بڑھے گا اور کچھ ہلکی پھلکی نصابی کتابوں پر مبنی درس و تدریس کو بھی شامل کیا جائے گا اور اس طرح زیادہ رسمی لیکن تعاملی (انٹریکٹیو) طریقہ تدریس کے ذریعہ تعلیم کی

طرف قدم بڑھایا جائے گا۔ جس میں پڑھنا، لکھنا، بولنا، جسمانی تعلیم، آرٹ، زبان، سائنس اور ریاضی بھی شامل ہوں گے۔ مڈل اسٹیج میں بھی تین سال کی تعلیم ہوگی اور اس میں موضوع پر مہارت رکھنے والے اساتذہ کے ذریعہ ہر موضوع کی تلخیص وتشریح پر کام شروع ہوگا، جس کے لیے طلبہ کی مناسب تیاری پوری ہوچکی ہوگی۔ یہ کام سائنس، ریاضی، فنون، کھیل، سوشل سائنس، ہیومنیٹیز اور پیشہ ورانہ موضوعات میں ہوں گے۔ ہر موضوع میں تجربات پر مبنی تدریس اور موضوع پر ماہر اساتذہ کے آجانے کے باوجود موضوعات کے درمیان باہمی تعلق دیکھنے پر ابھارا جائے گا۔ ہائی اسکول یا سیکنڈری اسٹیج میں چار سال کی کثیر موضوعاتی تعلیم شامل ہوگی جو اس اسٹیج کے موضوع پر مبنی طریقہ تدریس پر مبنی ہوگی۔ لیکن یہ تدریسی نظام زیادہ گہرائی، زیادہ تنقیدی سوچ، زندگی کے مقاصد پر زیادہ توجہ اور طلبہ کے ذریعہ موضوعات کے انتخاب کے تئیں زیادہ لچک کے ساتھ ہوگا۔ خاص طور پر اگر کسی کی خواہش ہو تو دسویں درجہ کے بعد ووکیشنل یا کسی خصوصی اسکول میں گریڈ 11-12 میں دوسرے کورس کے انتخاب کے متبادل طلبہ کے لیے لگاتار کھلے رہیں گے۔ (قومی تعلیمی پالیسی-2020)

تنقیدی سوچ کو بڑھانے کے لیے نصاب کے مواد کو کم کرنا:

نصاب کے مواد کو ہر موضوع میں کم کر کے اس کو بے حد بنیادی چیزوں پر مرکوز کیا جائے گا تاکہ تنقیدی فکر اور جستجو، مباحثہ اور تجزیہ پر مبنی جامع تعلیم پر ضروری توجہ دی جاسکے۔ یہ نصابی مواد اب بنیادی تصورات، افکار، تجربات اور مسائل کے حل پر مرکوز ہوں گے۔ تعلیم کا کام اب زیادہ تعاملی طریقہ سے انجام دیا جائے گا۔ سوال پوچھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور درجات میں باقاعدہ طور پر زیادہ پرکشش، تخلیقی، باہمی تعاون کے ساتھ اور تحقیقاتی سرگرمیاں ہوں گی تاکہ گہرا اور زیادہ تجرباتی علم یقینی بنایا جاسکے۔

اختتامیہ:

مذکورہ بالا مراحل خاص طور پر نصابی اور تعلیمی اصولوں پر مبنی ہیں، جنہیں کچھ اس طرح سے ڈیزائن کیا گیا ہے تاکہ بچوں کی علمی ترقی کے مطابق طلبہ کا سیکھنا ہوسکے۔ یہ مراحل قومی اور ریاستی نصاب تعلیم اور سیکھنے سکھانے کی حکمت عملیوں کی توسیع کی جانب رہنمائی کرنے میں مدد کریں گے لیکن ان کا اثر جسمانی ساخت میں متوازی تبدیلیوں پر نہیں پڑے گا"۔

اسکولوں میں کمپیوٹر کے داخلے سے تعلیمی جائزے اور اس کے اسباب واثرات کے تعلق کو سمجھ کر سیکھنے کا عمل ہے۔ آئی سی ٹی نے طلباء کو وہ پلیٹ فارم فراہم کرایا ہے کہ جہاں پر وہ غلطی ہونے پر بغیر ڈرے، اور فیل ہونے کے خوف سے نکل کر آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرسکتے ہیں اور سیکھ سکتے ہیں۔

این سی ایف۔2005 یہ بتاتی ہے کہ طلباء کی اسکولی زندگی کو بیرون دنیا کی زندگی سے جوڑنا چاہیے اور ہر مضمون میں حفظ کرادینے کے رواج کو روکنا چاہیئے۔ اس دور میں اسکول کو ایک چھوٹے سماج کی طرح بنانا ضروری ہے تاکہ بچے اسکول میں سماج کی ساخت کو سمجھ سکیں اور حاصل شدہ معلومات یا علم کا استعمال ضرورت کے وقت بیرون دنیا کی زندگی میں کرسکیں۔ اس کے علاوہ سیکھنے کے ایسے طریقوں کو کلاس میں استعمال کیا جانا چاہیے کہ جس سے بچے کھیل کھیل میں سیکھ سکیں۔ ماحول کے ساتھ ہی کچھ تعامل کر کے بچوں میں جدت طرازی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ریاضی سیکھنے کے لیے بچے کو اس کے ماحول سے ہم آہنگ کر کے تعلیم دی جانی چاہیئے اس کے لیے آئیسی ٹی ہماری مدد کررہی ہے۔

آج کے دور میں طلباء کی انفرادیت، دلچسپی، آموزش میں ان کی ضرورتیں، ان کے رجحان اور سیکھنے کے طریقوں پر زیادہ دھیان دیا جارہا ہے

تمام مراحل میں نصاب تعلیم اور تعلیمی اصولوں کی اصلاح کا کلیدی زاویہ ہوگا کہ نظام تعلیم کو رٹنے کے پرانے رواج سے ہٹا کر حقیقی فہم اور علم کی طرف لے جایا جائے۔ تعلیم کا مقصد صرف علمی سمجھ نہ ہو کر کردار کی تعمیر اور اکیسویں صدی کی اہم مہارت سے آراستہ کرنا ہے۔ حقیقت میں علم ایک پوشیدہ خزانہ ہے اور تعلیم فرد کی صلاحیت کے ساتھ اس کو حاصل کرنے میں مدد کرتی ہے۔ نصاب اور طریقۂ تدریس کو ان اہداف کے حصول کے لیے دوبارہ تیار کیا جائے گا۔ ماقبل اسکول سے اعلیٰ ترین تعلیم تک ہر سطح پر انضمام کے لیے مختلف شعبوں میں خصوصی مہارت اور اقدار کی پہچان کرائی جائے گی۔ درس وتدریس کے عمل میں ان مہارتوں اور اقدام کو ضم کیا جارہا ہے۔ یہ یقینی بنانے کے لیے نصابی ڈھانچہ اور نظام مواصلات تیار کیا جائے گا۔ ای سی ای آر ٹی ان متوقع مہارتوں کی پہچان کرے گا اور بچپن کی ابتدائی تعلیم اور اسکولی تعلیم کے لیے قومی نصابی ڈھانچے میں ان کو برتنے کے لیے میکانزم بنائے گا۔

حوالہ جات:

۔قومی تعلیمی پالیسی 2020، حکومت ہند، اردو ترجمہ: سید محمد عادل فریدی، شائع کردہ: شعبہ نشر واشاعت امارات شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

۔ششی پربھا۔2016۔کیسی ہوگی شکشا2025ء میں۔ بھارتیہ آدھونک شکشا، جنوری۔2016، این سی ای آر ٹی، دہلی۔

۔این. فاطمہ۔2018۔ خوشحال ودیالیہ اور خوشحال ودیارتھی۔ بھارتیہ آدھونک شکشا، اکتوبر 2018 این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ نئی دہلی۔

student, a parent, a teacher, or us, as a Higher Education Institution/University?. Adesh University Journal of Medical Sciences & Research, 2(2), 70-79.

Gupta, P. (2020). Indian Academy of Pediatrics Guidelines on School Reopening, Remote Learning and Curriculum in and After the COVID-19 Pandemic. Indian pediatrics, 57(12), 1153-1165.and secondary education. Notes, 56, 28.

https://www.businesstoday.in › s...Web result National Education Policy 2020: From 5+3+3+4 format to new UG, PG ...

https://en.m.wikipedia.org › wiki National Education Policy 2020 - Wikipedia

https://taxila.in › blog › the-new-edThe New Education Policy in India - Major Highlights and Changes Listedphttps://www.mindler.com › blog › n.eb results

5 Key things regarding National Education Policy 2020 - Mindler

Morris, M. (2016). Curriculum studies guidebooks: Concepts and theoretical frameworks.

Nordin, A., & Sundberg, D. (2016). Travelling concepts in national curriculupolicy-making: The example of competencies. European

C Education.Educational Research Journal, 15(3), 314-328.

Marsh, C. J. (2009). Key concepts for understanding curriculum. Routled

https://www.mhrd.gov.in › C...PDF

Untitled - Ministry of Education Government of India

□□□

Dr. Viquar Unnisa

Associate Professor

Dept. of Education and Training

Mualana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (Telangana)

NCERT National Curriculum Framework

Chhokar, K. B. (2010). Higher education and curriculum innovation for sustainable development in India. International Journal of Sustainability in Higher Education.Educational Research Journal, 15(3), 314-328.

Delhi, A. B. R. S. M. A. (2020). Building Knowledge Society through Pedagogy and Curriculum Innovations with Reference to National Education Policy 2020 (Doctoral dissertation, Central University of Gujarat).

Gupta, P. (2020). Indian Academy of Pediatrics Guidelines on School Reopening, Remote Learning and Curriculum in and After the COVID-19 Pandemic. Indian pediatrics, 57(12), 1153-1165.and secondary education. Notes, 56, 28.

https://www.businesstoday.in › s...

Web results

National Education Policy 2020: From 5+3+3+4 format to new UG, PG ...

https://en.m.wikipedia.org › wiki

National Education Policy 2020 - Wikipedia

https://taxila.in › blog › the-new-ed...

The New Education Policy in India - Major Highlights and Changes Listedp

https://www.mindler.com › blog › n...

Web results

Mindler Morris, M. (2016). Curriculum studies guidebooks: Concepts and theoretical frameworks. 5 Key things regarding National Education Policy 2020

Marsh, C. J. (2009). Key concepts for understanding curriculum. Routledge.

https://www.mhrd.gov.in › C...PDF

Untitled - Ministry of Education Government of India

Nordin, A., & Sundberg, D. (2016). Travelling concepts in national curriculum policy-making: The example of competencies. European

Panditrao, M. M., & Panditrao, M. M. (2020). National Education Policy 2020: What is in it for a

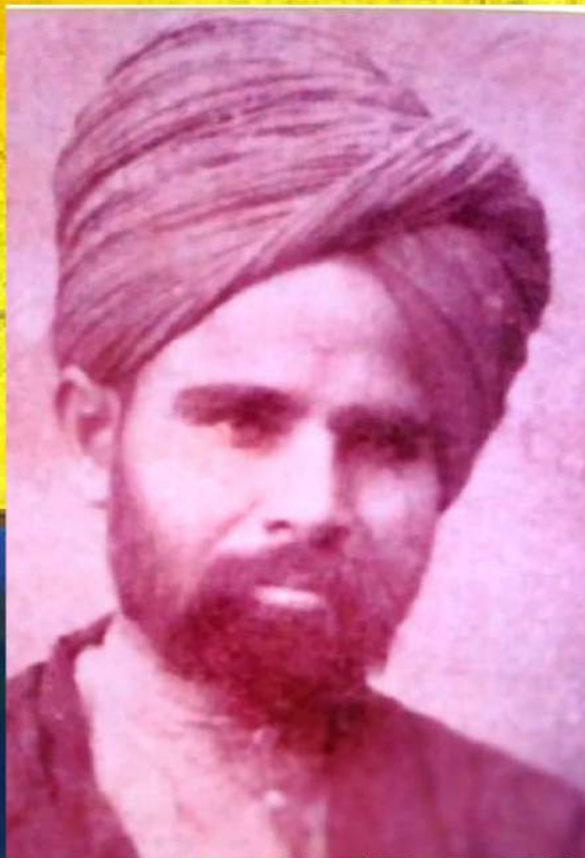

ڈاکٹر شہناز بیگم

مولوی نجم الغنی کی تاریخ نگاری

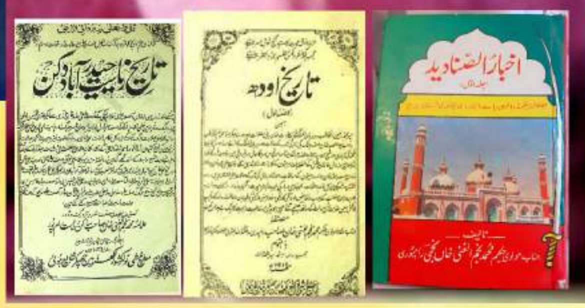

نجم الغنی کی ولادت 1859 کو رامپور میں ہوئی۔ان کے والد عبدالغنی خاں ریاست اودے پور میں1863 سے لے کر 1893 تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

نجم الغنی خاں کی ابتدائی تعلیم و تربیت اودے پور میں والد کے زیرِ سایہ ہوئی1889 میں مدرسہ عالیہ رامپور کے درجۂ اعلیٰ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔اسی زمانہ میں انھوں نے اُردو فارسی اور عربی کی اچھی استعداد پیدا کرلی۔ رامپور میں مولوی عبدالحق خیرآبادی سے قدیم فلسفہ، مولوی محمد طیب ادیب مکی سے عربی ادب اور حکیم محمد اعظم سے طب کا علم حاصل کیا۔انھوں نے ملازمت کی ابتدا رامپور سے کی۔1890 تک رامپور میں منصرم اوقاف رہے۔

1901 میں ان کی تقرری مدرس اعلیٰ کی حیثیت سے مہارانا ہائی اسکول اودے پور میں ہوئی۔ جہاں وہ 1924 تک ملازم رہے۔ رٹائرمنٹ کے بعد تصنیف و تالیف کے مشغلے میں تیزی سے اضافہ ہوا۔

نجم الغنی کی تاریخ نگاری

مولوی صاحب فن تاریخ نگاری کی باریکیوں سے بھی واقف تھے۔

بقول نجم الغنی:

''تاریخ نگاری کے راستے میں ایک سخت کانٹا یہ موجود ہے کہ اپنے وقت کے حکام کے حالات صحیح صحیح قلمبند کرنے میں ہزاروں دشواریاں ہیں البتہ گزشتہ حکام کے حالات لکھنے میں جو لوگ جہاں سے گزر گئے ہیں اندیشہ نہیں ہے۔مگر لوگوں کو جو دیسی ریاستوں کے باشندے ہیں اپنے وطن کے گزشتہ لوگوں کے حالات لکھنے میں ان مشکلات سے رستگاری نہیں ہوتی ہے۔''

تاریخ سے متعلق ان کے نظریات اس طرح ہیں۔

''تاریخ ایک آئینہ ہے۔جس سے ہم زمانہ ماضی کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور چونکہ ان حالات کا علم

انسان کے تجربے اور معلومات کا دائرہ زیادہ وسیع کردینا ہے۔ اس لیے تاریخ ایک نہایت قابلِ قدر چیز سمجھی جاتی ہے۔ علم تاریخ اشخاص کے حالوں اور ان کے شہروں اور واقعات اور عادتوں اور صنائع بدائع اور ان کے نسبوں اور مرنے کے وقتوں کے جان لینے کو کہتے ہیں۔ تاریخ میں زمانہ گزشتہ کے اشخاص مثلاً نبیوں، ولیوں، عالموں، فلاسفروں بادشاہوں، شاعروں کا حال بیان کیا جاتا ہے یہی اس کا موضوع ہے۔" (اخبار الصنادید، جلد اوّل، نجم الغنی، ص۔8۔9)

نجم الغنی کی تاریخ کے موضوع پر تصانیف

نجم الغنی وسیع المطالعہ صاحبِ نظر، مورخ، لغت نویس، ادیب، منطق وفلسفہ داں تھے۔ انھوں نے علم کلام، فقہ واصول، طب اور تصوف جیسے موضوعات پر لامحدود کتابیں تحریر کیں۔ بحیثیت مورخ انھوں نے تاریخ کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں تاریخ اودھ، اخبار الصنادید تاریخ ریاست حیدرآباد دکن، تاریخ رجگانِ ہند، موسوم بہ وقائع راجستھان وغیرہ مشہور تاریخ کے موضوع سے متعلق کتابیں ہیں۔ ذیل میں ان تاریخوں کا تعارف درج ہے۔

تاریخ اودھ

تاریخ اودھ نوابانِ اودھ کے حالات نواب سعادت خاں برہان الملک بانی سلطنت کے عہد سے خاتم السلاطین جانعالم واجد علی شاہ کے عہد تک مشتمل ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کی تصنیف وتالیف میں فارسی اور اُردو کے عصری ماخذات سے استفادہ کیا۔ اس طرح یہ تاریخ ایک مکمل مجموعہ ہے۔ ان تمام تاریخی واقعات کا جو عصری ماخذات میں درج ہیں۔ ان عصری ماخذات میں محتشم خانی سلطان الحکایات امراۃ الاوضاع وغیرہ اہم کتابیں شامل ہیں۔

اس طرح اس کتاب میں تفصیلی طور پر پوری تاریخ اودھ اور اس کے جملہ متعلقات کو کم وبیش پورے عصری اور موجودہ ماخذات کے حوالوں کے ساتھ بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مؤلف نے موافق اور مخالف رایوں اور ہر قسم کی معروف روایتوں کو بھی قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب ضمنی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں حوالوں کا بھی جابجا استعمال ملتا ہے جس سے ضمنی تفصیلات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس کا مجموعی حجم 844 صفحات ہیں۔ ان جلدوں کا مفصل تعارف اس طرح ہے۔

تاریخ اودھ، جلد اوّل 1909، مطبع، نامی مطبع العلوم مرادآباد، صفحات 190
تاریخ اودھ، جلد دوم، 1910، مطبع نامی مطبع العلوم مرادآباد، صفحات 296
تاریخ اودھ، جلد سوم، 1912، مطبع نامی مطبع العلوم مرادآباد، صفحات 242
تاریخ اودھ، جلد چہارم 1910، مطبع نامی مطبع العلوم مرادآباد، صفحات 134

تاریخ اودھ: جلد اوّل

(مملوکہ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

تاریخ اودھ جلد اوّل 1909 میں شائع ہوئی جو 190 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں میر محمد امین المخاطب بہ برہان الملک نواب سعادت خاں بانی سلطنت اودھ سے لے کر مرزا محمد مقیم المخاطب بہ نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے عہد کے وہ تمام واقعات درج ہیں۔ جو اودھ، روہیلکھنڈ اور دہلی میں سیاسی وانتظامی حالات کے سلسلے میں پیش آئے۔ جن کا تعلق براہِ راست نوابان اودھ سے ہے۔ ان حالات کے علاوہ برہان الملک کا نسب، اودھ کی حقیقت، لکھنؤ کی آبادی اور شیخ زادے، حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب قدس سرہ کا حال اور اس کے ساتھ ساتھ دربارِ دہلی میں ساداتِ بارہہ کا قابوان کا عروج وزوال، خاندانِ بنگش کے انقلابات، مرہٹوں کے کارنامے، نادرشاہی حملے، نواب سید علی محمد خاں بہادر ونواب سید سعداللہ خاں بہادر روہیلوں کے سوانحات، احمد شاہ ابدالی کی آمد کے حالات یعنی 1131ھ سے 1167ھ تک جز وکل تمام واقعات درج ہیں۔

تاریخ اودھ: جلد دوم

تاریخ اودھ جلد دوم 1910 میں مطبع العلوم مرادآباد سے شائع ہوئی۔ جو 296 صفحات کی ضخامت رکھتی ہے۔ اس جلد میں نواب شجاع الدولہ کی مسند نشینی سے نواب وزیر علی خاں کی معزولی اور خارج کیے جانے تک کے حالات درج ہیں۔ یعنی یہ جلد نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ اور وزیر علی خاں کے عہد تک مشتمل ہے۔ اسی جلد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شجاع الدولہ نے جہاں اپنی زندگی میں سلطنت اودھ کے رقبے کو ظلم و ستم اختیار کر کے وسعت دی وہاں سلطنت کو اس قدر کمزور بھی بنادیا کہ پھر اس کو تقویت حاصل نہ ہوسکی اس موضوع پر اس جلد میں نہایت خوبی سے واقعات درج کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ شجاع الدولہ سے انگریزوں کے جو تعلقات رہے ان پر بھی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ نجیب آباد، بریلی اور رامپور میں ان کے مظالم کی عبرت ناک واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔ شجاع الدولہ وآصف الدولہ سے انگریزوں کے معاہدوں پر بحث وتنقید کی گئی ہے اور اس موقع کی تمام روایات صدق وکذب کی اچھی تحقیقات کی ہے۔ اسی جلد میں روہیل کھنڈ کی تاریخ اور دردناک مناظر ظلم و ستم دیکھنے کے قابل ہیں۔ غرض کہ اس میں انگریزوں کے اقتدار کا آغاز،

اور مسلمانوں کی باہمی نااتفاقیاں خودغرضیاں اور تباہی اور دربارِ دہلی کی کمزروی کے عبرت ناک وسبق آموز مناظر درج ہیں۔

تاریخ اودھ: جلد سوم

تاریخ اودھ جلد سوم 1912 مطبع العلوم مرادآباد سے شائع ہوئی۔ جو 224 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں نواب سعادت علی خاں، نواب غازی الدین حیدر خاں، نصیر الدین حیدر خاں اور رفیع الدین حیدر کے زمانے کے واقعات درج ہیں۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں زیادہ تر انگریزی مداخلت اور معاہدوں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ نواب غازی الدین حیدر کے بادشاہ بننے اور اس کے وزرا کی چالاکیوں اور سلطنت کی بدنظمیوں کا حال نصیر الدین حیدر کا مسند نشین ہوکر لہوولعب میں مشغول ہونا درج ہے۔ اس کے علاوہ نصیر الدین حیدر کی مذہبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ شخص غم شہدائے کربلا میں عجیب وغریب مصارف اور طرح طرح کے کھیل تماشے کرتا تھا۔ خود تعزیہ اٹھاتا اور مرثیہ پڑھتا تھا۔ ذاتی زندگی کے لحاظ سے بھی اس کے واقعات نہایت رکیک ہیں۔

تاریخ اودھ: جلد چہارم

تاریخ اودھ جلد چہارم اپریل 1913 میں مرادآباد سے شائع ہوئی جو 134 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مرزا محمد علی خاں، امجد علی خاں اور واجد علی خاں کے حالات درج ہیں اور خصوصیت کے ساتھ واجد علی شاہ کے حالات بھی قابلِ دید ہیں۔ نجم الغنی نے واجد علی شاہ کے تمام حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں اور کوئی چھوٹا سا چھوٹا واقعہ بھی نہیں چھوڑا ہے۔

تاریخ اودھ جلد چہارم کا وہ حصہ قابل مطالعہ ہے جس میں نجم الغنی نے اودھ کے باغات، محلات، درگاہوں و دیگر عمارات کا ذکر بڑی شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔ اس ضمن میں فرح بخش، کوٹھی دل کشا، قدم رسول، درگاہ حضرت عباس، موسیٰ باغ، موتی محل، شاہ منزل، خورشید منزل، ماہ منزل وغیرہ عمارات کا تذکرہ کیا ہے۔

کوٹھی دل کشا کے بارے میں نجم الغنی لکھتے ہیں کہ

> ''اس کو نواب سعادت علی خاں نے اپنے سیر وشکار کے واسطے بنوایا تھا۔ اور گرد وپیش کے جنگل کو صاف کرواکر ایک چراگاہ مقرر کی تھی۔ اور اس میں جانوران ان شکاری مثل ہرن وغیرہ چھوڑوا دیتے تھے۔ اس کوٹھی میں اکثر بیگمات بھی سیر کے لیے آتی تھیں۔''

(تاریخ اودھ، جلد چہارم، نجم الغنی، مرادآباد 1910، ص۔87)

اسلوب

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے اس کتاب کو مصنف نے لامحدود کتب تواریخ اور رسالجات سے استفادہ کرکے نہایت قابلیت کے ساتھ روایتوں کے باہم فرق دکھلا کر تالیف کیا ہے۔ اس کا طرزِ بیان نہایت عمدہ اور دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ ترتیب اور واقعات اچھے ڈھنگ سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اکثر جگہ ماخذات کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ مصنف نے ہر واقعہ پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔

اس کتاب کی خوبی اس کا اندازِ نگارش ہے۔ جس میں واقعات و حالات کو جزوی تفصیلات کے ساتھ تحریر کیے کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ اس اندازِ نگارش میں مصنف کی طبیعت کی روانی نے ایک قسم کا افسانوی رنگ بھی پیدا کردیا ہے جو کہ ایک تاریخ کی کتاب کے لیے مناسب صورت نہیں اس طرح نجم الغنی نے اخلاقیات کی بحث میں جس میں بدکرداریوں اور کوتاہیوں کا ذکر ہو، خاصے جذباتی ہوجاتے ہیں اور ان کا لہجہ کافی ترش ہوجاتا۔ ایسے مقامات پر ان کی طول کلامی اور طویل سرخیاں بھی ایک تاریخ کی کتاب کے لیے ضرورت سے زیادہ نامناسب معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ فہرست مضامین بہت طویل ہے۔

اخبار الصنادید

مملوکہ اردو گھر لائبریری، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

اخبار الصنادید علاقۂ روہیلکھنڈ بالخصوص ریاست رامپور کے پٹھانوں کی مستند اور جامع تاریخ ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ، تین حصے اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں فن تاریخ کے فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد پہلے حصے میں افغان قوم کی تحقیقات کی ہے اور روہیلکھنڈ میں روہیلوں کا جماؤ اور ان کی حکومت قائم ہونے کے وقت سے نواب سید فیض اللہ خاں کے عہد تک کے حالات بیان کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں نواب علی محمد خاں ابن نواب سید فیض اللہ خاں کے عہد سے نواب سید مشتاق علی خاں کے عہد کے واقعات درج ہیں اور تیسرے حصے میں نواب سید حامد علی خاں بہادر کی تخت نشینی سے لے کر سنہ تصنیف تک کے واقعات درج ہیں۔ خاتمہ میں ریاست رامپور کے جغرافیہ، پٹھانوں کے تمدن ومعاشرت پر نظر ثانی کی ہے۔

ماخذات

نجم الغنی خاں نے اس کتاب کو عربی، فارسی اور انگریزی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب تاریخ ورسالجات وغیرہ سے لے کر نہایت قابلیت کے ساتھ تالیف کیا ہے۔ جن کی ایک فہرست بھی درج کی ہے۔ علاوہ ازیں بقول

مصنف کے کچھ مستندلوگوں کے بیانات کوبھی بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔

اس کتاب میں زیادہ تر حالات فرح بخش، عماد السعادت گلستانِ رحمت اخبار حسن، تاریخ فرخ آباد، مرات آفتاب نما وغیرہ ماخذ سے لیے گئے ہیں۔

اسلوب

اس کتاب کا اسلوب نہایت متعدل، پختہ اور رواں ہے یعنی نجم الغنی نے سادہ اور عام فہم اسلوب استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن عربی، فارسی اور انگریزی کے مروجہ الفاظ کے استعمال سے اجتناب بھی نہیں کیا ہے۔ یہ کتاب اس طرز پر لکھی گئی ہے جو اخبار کا ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے۔

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے اخبار الصنادید کی دونوں جلدوں کو فصول اور ابواب میں منقسم نہیں کیا ہے۔ اس بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ

> ''پہلے زمانے میں ہر ایک کتاب یا رسالہ مقدمہ، ابواب، اور خاتمہ پر منقسم ہوتا تھا۔ اب تحریرات انگریزی کی تقلید سے یہ بات اُردو میں بھی چھوٹتی جاتی ہے۔ اور کتاب اس طرز سے لکھی جاتی ہے جو اخبار کا ایک مضمون سا معلوم ہوتا ہے۔''

اس کتاب میں نجم الغنی نے وضاحتی عنوانات قائم کر کے واقعات کو اس طرح قلم بند کیا ہے کہ پورا بیان ایک چست مضمون معلوم ہوتا ہے۔ کتاب میں بعض مضامین مختصر ہیں اور بعض طویل ہیں۔

یہ ضخیم کتاب دو جلدوں میں ترتیب دی گئی ہے۔ جس کا مجموعی حجم تقریباً 1385 صفحات ہیں۔

اخبار الصنادید (جلد اوّل)

اخبار الصنادید جلد اوّل مطبع منشی نولکشور واقع لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ یہ جلد 814 صفحات کی ضخامت رکھتی ہے۔ اس جلد میں افغان قوم کے نسب اور لفظ پٹھان کی تحقیق پر ایک مضمون درج ہے۔ اس کے علاوہ روہیل کھنڈ میں ان کی آمد اور قیامِ حکومت سے لے کر نواب سید احمد علی خاں کے انتقال اور ڈک صاحب کا مع سپاہ انتظام کی غرض سے رامپور آنا، تک کے واقعات درج ہیں۔

اس جلد میں نوابین ریاست رامپور اور تاریخی عمارات کی تصاویر بھی شامل ہیں اس کے علاوہ جلد کے آخر میں صفحہ 757 سے 814 صفحات تک اشاریہ جات بھی درج ہیں۔ اس جلد کی تصنیف وتالیف میں نجم الغنی نے جن ماخذات سے استفادہ کیا ہے ان میں تاریخ فرشتہ، تاریخ فرخ آباد ولی اللہ، تاریخ مالوہ، تاریخ سادات بارہ، تاریخ راجگان پنجاب، تاریخ روہیلکھنڈ، تاریخ مظفری، تاریخ ہندوستان از ذکاء اللہ، جام جہاں نما، طبقاتِ ناصرہ، طبقاتِ الشعراء، طلسم ہند، عماد السعادت، فرح بخش، فرہنگ آصفیہ، قیصر التواریخ، ماثر الامراء، مرأت آفتاب نما، وقائع راجپوتانا اور ہفت اقلیم وغیرہ اہم ہے۔

اخبار الصنادید (جلد دوم)

اخبار الصنادید جلد دوم 1918 میں مطبع نولکشور واقع لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ جو 571 صفحات پر مشتمل ہے۔

اس جلد میں نواب محمد سعید خاں (1840-1855) کے عہد سے لے کر نواب حامد علی خاں (1889-1930) کے عہد تک کے ریاست رامپور اور اس سے وابستہ علاقوں کے سیاسی، سماجی، تاریخی اور ثقافتی احوال کو نہایت شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے۔ اس جلد کے آخر میں بعنوان ''اخبار الصنادید کا خاتمہ'' درج ہے۔ جس سے ریاست رامپور کے جغرافیائی حالات کے ساتھ ساتھ وہاں کی اقوام، ان کا طرز معاشرات، پٹھانوں کا طرز معاشرت، مراسم ودستورات وغیرہ کی معلومات فراہم ہوتی ہے۔

فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ اس میں رامپور میں پائی جانے والی عمارتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان عمارات کی تصاویر بھی منسلک کی گئی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت رامپور میں بھی فنِ تعمیر ترقی پذیر تھا۔

علم وادب اور ثقافتی نقطۂ نظر سے بھی اس جلد کی اہمیت ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب کلب علی خاں کے دور میں دیگر فنون کی طرح علم وادب کی بھی کافی ترقی ہوئی اس طرح نوابین ریاست رامپور کے ذوق علم وادب اور علماء وفضلہ کی سرپرستی کی بدولت ہی رامپور اس عہد میں علم وادب کا مرکز بن گیا۔

نجم الغنی نے رامپور کے خاص شہر کی جن عمارتوں کا ذکر کیا ہے ان میں حامد منزل، رنگ محل، مچھی بھون، مہمان خانہ انگریزی، ہندوستانی کتب خانہ وغیرہ عمارتوں کا ذکر کیا ہے۔ جامع مسجد کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ اس مسجد کی تعمیر ایک قابل نمود مذہبی عمارت ثابت ہے۔ نواب خلد آشیاں نے جو بڑی جامع مسجد تیار کرائی تھی وہ اب مخدوش حالت میں تھی آپ نے سید فیض اللہ خاں بہادر اور نواب سید کلب خان بہادر کی عمارتوں کو ملا کر از سر نو خوش نما شاندار مسجد بنوادی۔ (اخبار الصنادید، جلد دوم، نجم الغنی، ص۔458)

نجم الغنی نے اس جلد میں قلعۂ معلّی کی باہر کی عمارتوں میں کوٹھی خسرو

باغ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''کوٹھی خسرو باغ نہایت فرحت افزا اور قابل دید ہے۔ کئی منزل کی عمارت ہے۔ نواب صاحب اس میں برسوں سے قیام فرما رہے ہیں۔ شہر کے تین میل کے فاصلے پر جانب شمال مشہور و معروف کوٹھی بے نظیر اور اس کا وسیع باغ ہے۔ کوٹھی کو مرتفع کرسی دے کر اعلیٰ طور کی جدید صناعی سے بنایا ہے۔ مغربی جانب پختہ تالاب ہے جس نے اس کی سینری کو اور زیادہ دل فریب اور پُر لطف کر دیا ہے۔''

(اخبار الصنادید، جلد دوم، نجم الغنی، ص۔459)

یہ جلد اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں 1857 کی پہلی جنگِ عظیم آزادی میں دہلی اور لکھنؤ کی ریاستوں کے خاتمے سے پیدا ہونے والے حالات کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ ریاستوں کو شیرازہ بکھرنے کے بعد ان ریاستوں کے علماء فضلا، شعراء خوش نویسی، مصور و دیگر فنکار اور مشاہیرِ وقت کو رامپور میں ان کے مقام و مرتبے کے لحاظ سے عہد اور رتبے دیے گئے۔

اس طرح واقعات غدر 1857 سے متعلق ایک ضمنی عنوان ''انتظامِ رسد رسانی نینی تال'' کے تحت اس مدد کی تفصیل پیش کی جو ریاست رام پور کی طرف سے ان انگریزوں کی دی گئی تھی جو اپنی جان بچا کر نینی تال میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ ایسی تفصیل کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ملتی، لہٰذا ''واقعاتِ غدر 1857'' کے ذیل میں یہ معلومات کافی اہم ہے جس سے مورخین نے استفادہ کیا۔

اس کے علاوہ نجم الغنی نے اس جلد میں رام پور کے عہد حکومت میں جو اصلاحات بندوبست قانون و معدالت اور شہر کے انتظام میں ہوئی تھیں، ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ شہر رام پور میں بجلی اور ٹیلی فون کی سہولت کا آغاز، کارخانوں کا کھلنا، قلعے کی عمارت کی تعمیر، کتب خانہ، غراداری اور علمی و ادبی سرگرمیوں پر معلومات فراہم کی ہیں۔

اس طرح انھوں نے اخبار الصنادید جلد دوم میں ریاست رام پور کی تاریخ کے ساتھ وہاں کی ثقافتی سرگرمیوں کو بھی پیش کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔

نجم الغنی نے واقعات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ان اخلاقی آراء پر بھی نظر رکھی جو مورخین کے مابین تھیں۔ انھوں نے اپنی رائے ضرور دی لیکن کسی واقع سے متعلق مختلف روایات کو نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے اُس عہد کی تاریخ نگاری کی روایت کے مطابق واقعات کو جزئیاتی تفصیل کے ساتھ قلم بند کرتے ہوئے ماخذات کے حوالوں کو درج کرتے وقت کسی مقررہ اصول کی پابندی نہیں کی۔

اخبار الصنادید کی اہم ترین خصوصیات یہ ہے کہ نجم الغنی نے معروضی طریقۂ اظہار اختیار کر کے واقعات کو سادہ سلیس زبان میں تحریر کیا ہے۔ اس طرح اخبار الصنادید اپنے عہد کے معیاری تاریخ نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

تاریخ راجگانِ ہند موسوم بہ وقائع راجستھان

(مملوکہ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

نجم الغنی کی ''تاریخ راجگان ہند موسوم بہ وقائع'' لکھنؤ سے 1927 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس کا مجموعی حجم 624 صفحات ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں فارسی، اُردو، عربی اور ہندی ماخذات سے استفادہ کیا۔

''تاریخ راجگانِ ہند'' میں راجپوتوں اور اس کی مختلف شاخوں کا مفصل و مستند درج ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح اصلی باشندگانِ ہند کو مغلوب کر کے ملک پر قابض ہوئیں اور ہندوستان میں رہ کر ''ہندو'' کہلانے لگیں۔ ان اقوام کے بعد مسلمانوں کا آنا ان کے عروج و زوال کے بعد انگریزی حکومت کا قائم ہونا وغیرہ وغیرہ تازمانۂ حال بیان کیا گیا ہے یہ کتاب رزم بزم، روایات و رسوم، تاریخی و جغرافیائی وغیرہ پہلوؤں کا اہم ترین ماخذ ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نجم الغنی نے کرنل ٹاڈ و دیگر مورخین کی تمام غلط بیانیوں کی تردید دلائل و ثبوت کے ساتھ پیش کی ہے۔

تاریخ ریاست حیدر آباد

(مملوکہ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

تاریخ ریاست حیدر آباد دکن 1930 میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے جس کا مجموعی حجم تقریباً 628 صفحات ہیں۔

تاریخ ریاست حیدر آباد دکن: حصہ اوّل

تاریخ ریاست حیدر آباد دکن اوّل میں خاندان آصف جاہی نظام الملکی کے مورث اعلیٰ عابد خاں تاتاری سے لے کر غازی الدین خاں فیروز جنگ اور قمر الدین خاں نظام الدین الملک جاہ اوّل اور میر احمد خاں ناصر جنگ اور ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ اور سید محمد خاں صلابت جنگ تک کے جملہ حالات نہایت تحقیق و تدقیق سے دلچسپ پیرائے میں تحریر کیے گئے ہیں علاوہ ازیں نسب نامۂ نظام نوابانِ حیدر آباد اپنے ناموں کے ساتھ الفاظ میر و خواجہ کیوں لگاتے تھے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

ان واقعات کے علاوہ دربارِ دہلی میں سادات بارہہ کا قابوان کا عروج وانحطاط، سادات بارہہ کے ہاتھ سے فرخ سیر کا مارا جانا، محمد شاہی دربار کے عبرت ناک حالات، مرہٹوں کی فوج کشیاں، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے، پانی پت کے میدان میں احمد شاہ کے ہاتھ سے مرہٹوں کا استحصال غرض کہ سیاسی واقعات کے ساتھ حیدرآباد ریاست کی جغرافیائی حالت، ریاست کی وسعت، صناعی اور کاریگری قدیم اقوام اور اس عہد سے متعلق دیگر واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔

اس حصے کے آخر میں ضمیمہ تاریخ حیدرآباد درج ہے۔ جس میں محمد شاہ کے معتدد (سات) فرمان نظام الملک آصف جاہ اوّل کے نام موجود ہیں ان فرمان کا لفظی ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

تاریخ ریاست حیدرآباد دکن حصہ دوم

حصہ دوم میں میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی، حیدرآباد علی خاں کی ریاست کی ابتداء، نظام اور مرہٹوں کا ٹیپو سلطان سے لڑنے کے لیے اتفاق کرنا، مرہٹوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ معرکہ آرائیاں، میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث، میر خندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع، میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس، میر محبوب علی خاں فتح جنگ آصف جاہ سادس اور میر عثمان علی خاں بہادر آصف کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔

اس طرح نجم الغنی رامپور کی دیگر عبقری شخصیات کی طرح ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت تھے۔ جنھوں نے مختلف علوم کے ساتھ ساتھ تاریخ نگاری کو ایک نئی سمت دی اور اس طرح ان کی تصانیف اُردو تاریخ نگاری میں اضافہ کی باعث ہیں۔

□□□

Dr. Shahnaz Begum
3234 Kucha Pandit
Lal Kuan
Delhi-110006

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ بتاریخ........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

ڈاکٹر گلشن آرا

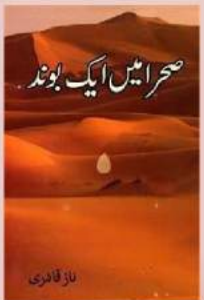

ناز قادری کی ادبی خدمات

آزادی کے بعد اردو زبان وادب کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کرنے والوں میں ایک معتبر و مستند نام ناقد و شاعر پروفیسر ناز قادری کا ہے۔ ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مشن و مقصد رہا کہ ہر صورتِ حال میں اردو نئی منزلوں اور فتوحات کے نئے مرحلوں سے گذرتی رہے۔ پروفیسر ناز قادری نے نام ونمود، صلے وستائش سے بے پرواہ ہوکر اردو زبان وادب کو نئی تازگی وتوانائی سے روشناس کرایا۔ ناز قادری اردو زبان وادب کا ایک ایسا درخشندہ نام ہے جن کی تحریروں کی جاذبیت، ادبیت، معنویت اور تہہ داری دیر اور دور تک محسوس کی جائے گی اور آنے والی نسلوں کے لیے یہ قیمتی علمی وادبی سرمایہ مشعلِ راہ بنے گا۔

ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اردو کی ترقی و اشاعت کے لیے مضطرب رہا اپنی آخری سانس تک اردو کی خدمت میں مصروف ومنہمک رہنے والے پروفیسر ناز قادری اپنی ذات میں ایک علمی و ادبی کائنات تھے۔ ایک انجمن اور ایک ادبی ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ پوری اردو دنیا ان کے نام وکام سے بخوبی واقف ہے۔ اردو دنیا میں ایسی عہد ساز شخصیتیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں سے نہ صرف ریسرچ اسکالرس، طلبا وطالبات بلکہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور دانشوروں کو بھی اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔ ان کے طلبا کی تعداد سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہیں جو آج پوری دنیا میں اپنے علم وہنر کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ طلبا کی ذہنی آبیاری اور ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی ورہبری ان کے فرض اولین میں شامل رہا۔ ہزاروں طلبا ان کی تحریروں سے سیراب و فیضیاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اس میں کسی شک وشبہ کی کہیں کوئی گنجائش نہیں کہ پروفیسر ناز قادری جیسی ادبی وعلمی شخصیت روز روز جنم نہیں لیتی۔

ان کی زندگی پوری ادبی دنیا کے لیے کھلی کتاب کی طرح ہے جو جہاں سے چاہے اس ورق کی تحریروں سے اپنی ایک دنیا آباد کرسکتا ہے۔ دبستان بہار کا یہ روشن ادبی چراغ کئی دہائیوں تک پوری آب وتاب کے ساتھ ہماری ادبی تاریخ میں ایک دستاویزی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ پروفیسر ناز قادری کا شماران ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے خاموش اور انعام و اعزاز سے اوپر اُٹھ کر اردو ادب کی بیش بہا خدمات میں اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ ان کی تحریروں کی گونج ادب کے ان ایوانوں تک بھی پہنچی جہاں ہرکسی کی رسائی ممکن نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان وادب کے حوالے سے جو گرانقدر، علمی وادبی خدمات انجام دیں وہ ہر عہد میں اپنی علمیت، افادیت، عظمت اور ادبی اہمیت سمیٹے ہوئے ہیں۔ وہ اردو ادب کا ایک ایسا نام ہے جس پر جتنا فخر و ناز کریں کم ہے۔ ایک ایسی پاکیزہ ادبی شخصیت پوری اردو دنیا کے لیے باعث افتخار ہے۔ درس و تدریس کے مقدس و منور پیشے سے وابستہ پروفیسر ناز قادری کا شمار ایسے معدودے چند دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کو ایک نیا وقار و معیار، نیا لب ولہجہ اور نئی تازگی و بصیرتوں سے روشناس کرایا۔ پوری اردو دنیا سے خط وکتابت اور گہرے مراسم رکھنے والے پروفیسر ناز قادری کی تن تنہا علمی شخصیت میں کئی ادبی حیات پوشیدہ ہیں۔ علم و ادب کے تمام اہم شعبوں واصناف ادب کے معروف میدانوں میں انھوں نے جو گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے ہیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے ہم کسی طور نظر انداز نہیں کرسکتے۔ پروفیسر ناز قادری کا مطالعہ وسیع، نگاہیں دوررس تھیں، کلاسیکی ادب ہو یا پھر ترقی پسند وجدید ادب، شعر وادب کے بدلتے ہوئے مزاج ومیلان پر گہری نظر رکھتے تھے۔ عالمی ادب پر ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور عمیق ہے۔ کسی بھی موضوع پر قلم اُٹھانے سے قبل ان تمام پہلوؤں اور گوشوں کو ضرور ملحوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس سلسلے معاون ومددگار ثابت ہوں۔ عجلت پسندی اور موسمی شہرت کو خود سے ہمیشہ دور رکھنے والے پروفیسر ناز قادری اپنی تحریروں میں ہر مقام ومنزل پر تسلسل و توازن کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اعتدال پسندی ان کی تحریروں کی خوشبو اور خوبصورتی ہے جو دوسرے ادبا وشعرا سے انھیں ممتاز بناتی ہے۔ پروفیسر ناز قادری کا ہمارے درمیان سے چلے جانا ایک عہد کا خاتمہ اور اردو دنیا کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کی ذات پوری اردو دنیا کے لیے غنیمت اور بابرکت تھی۔ اردو شعر وادب میں ان کی حیثیت عظمت اور علمی وادبی اہمیت مینارۂ نور کی تھی۔ لکھنا پڑھنا ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ اور مرکز ومحور رہا۔ خاص وعام ان کی چوکھٹ سے علم وادب کی پیاس بجھاتے رہے اور ایک اُمڈتا ہوا سیلاب ہمیشہ ان کے ارد گرد موجود رہا۔ یہ بڑی اور اہم بات تھی کہ اپنے چھوٹے سے شہر مظفر پور سے پوری اردو دنیا کو اپنی جانب متوجہ ومبذول کرانے پر مجبور کردیا۔ آج جبکہ پوری اردو دنیا شمس الرحمٰن فاروقی کی موت کا ماتم منا رہی ہے ایسے کرب انگیز اور صبر آزما موقع پر پروفیسر ناز قادری یاد آرہے ہیں۔ مرحوم فاروقی صاحب نے پروفیسر ناز قادری کی علمی عظمت اور ادبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے گرانقدر خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

> ”ناز قادری صاحب کا کلام اکثر نظر سے گذرتا رہتا ہے۔ فارسیت کے ذوق اور فارسی کے گہرے علم کے باعث ان کے یہاں خیال کو جامۂ نفیس پہنانے کی سعی بلیغ ملتی ہے۔ ناز قادری کاروبار دنیا سے بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن ان کی نگاہ اکثر وبیش تر اپنے اندر کے دشت وجود پر زیادہ مرتکز رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں ایک نفاست ایک علمی وقات ہے جس کی بنا پر وہ گہرے محسوسات کی دنیا کو بھی ہمارے سامنے اس طرح لاتے ہیں کہ نامانوس تجربے بھی مانوس اور گوارا لگنے لگتے ہیں۔ کئی غزلوں میں انہوں نے طباعی کے جوہر خوب دکھلائے ہیں“۔

پروفیسر ناز قادری کا اصل نام محی الدین انصاری ہے۔ والدین مولوی لیاقت حسین اور بی بی رشیدۃ النساء اور ان کی تاریخ ولادت 9 رنومبر 1940 مطابق نو ذی قعدہ 1359ھ ہے اور وفات 13 رنومبر 2019 مطابق 14 رربیع اول 1441ھ ہے۔ مقام پیدائش بروراج، ضلع مظفر پور بہار ہے۔ ایک بھائی مولانا دین نشاط القادری اور تین بہنیں، وکیلن خاتون ، سکینہ خاتون سعیدہ خاتون ہیں۔ پروفیسر ناز قادری کی شادی معروف شاعر وادبی وسماجی شخصیت شرف الدین احمد اشرف قادری کی صاحبزادی شمیم ناز سے بیتیا مغربی چمپارن، بتاریخ 16 رمئی 1966 مطابق 25 رمحرم الحرام 1386ھ ہوئی۔ بیٹوں میں صلاح الدین احمد، ضیاالدین احمد، شہاب الدین احمد، نظام الدین احمد، معین الدین احمد اور بیٹیوں میں ناہید فرزانہ، صبیحہ ناز اور شادیہ ناز۔ پروفیسر ناز قادری کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے اور یہ خاندان علاقہ میں محبوب ومعروف رہا ہے۔ شعبۂ تعلیم سے وابستہ اس خاندان کے کئی چراغ دنیا کے مختلف گوشوں کو اپنے علم وہنر کی روشنی سے منور کررہے ہیں۔

پروفیسر ناز قادری اپنے خاندانی پس منظر اور اپنی تعلیم وتربیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''خاندانی رسم ورواج کے مطابق ابتدائی دینی تعلیم اور ناظرہ قرآن کے بعد جدید تعلیم کے لیے مقامی اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لنگٹ سنگھ کالج مظفرپور میں داخلہ لیا جہاں اہل سنت والجماعت کے پیروکار اور دین دار اساتذہ ڈاکٹر اختر قادری، پروفیسر محمد سلیمان، پروفیسر شمیم احمد اور پروفیسر نجم الہدیٰ کی درس وتدریس اور فیض بخش ہم نشیں وہم کلامی میسر آئی۔ طالبِ علمی کے سنہرے ایام نے اپنی غلط انداز نگاہوں سے ابتدائی زندگی کو بھرم میں رکھا۔ ایم اے تک آتے آتے ممتاز کامیابی حاصل ہوئی۔
(سلسبیل نور میں)

پروفیسر ناز قادری کا باوقار خاندانی پس منظر، مذہبی ماحول، پاکیزہ تربیت نے اعلیٰ تعلیم کے مرحلوں اور منزلوں کو بحسن وخوبی طے کیا۔ ان کا یہی وہ خاندانی ماحول ہے جن میں ناز قادری کی پرورش و پرداخت نے انھیں ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام ومرتبہ پر فائز کیا اور ان کی تحریروں نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری میں مرکزی کردار ادا کیے۔ انھوں نے اردو ادب کے خزانوں میں ایک نئے باب کا اضافہ کرکے جو تاریخ ساز علمی و ادبی کارنامے انجام دیے ہیں وہ اردو نسل کے لیے ایک مشعلِ راہ ہے۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ پروفیسر ناز قادری کی علمی و ادبی خدمات ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہے۔ نامور ادیب فاروق ارگلی، پروفیسر ناز قادری کی عالمانہ ودانشورانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پروفیسر ناز قادری اردو کے وسیع النظر ناقد اور محقق ہیں، ان کی تنقیدی، تحقیقی کتابیں اربابِ نقد ونظر کے حلقوں میں توصیف و تحسین کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ دریافت اردو ناول کا سفر اور زاویے وغیرہ ان کی نگارشات ادبیات عالیہ کے طلبہ کے لیے بہترین رہنما ہیں۔ وہ بذات خود ایک حساس فن کار ہیں اس لیے ان کی تنقید کا انداز چیز ''چیر پھاڑ'' والدین بلکہ مروج اصول نقد کی پیروی کرتے ہوئے تمثال واستدلال کے ذریعہ فن پارہ کے محاسن اور مصائب کی نشاندہی نرمی و ہمدردی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی تنقید کو تجزیاتی اور قیمتی تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ناز صاحب بنیادی طور پر معلم ہیں۔ لہٰذا ان کا تنقیدی اور یہ طلبہ اور قارئین کو موضوع کے حسن وقبح سے واقف کرانے اور ذہن نشین کرانے کی کوشش زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

(ناز قادری شعر، فکشن اور تنقید جلد دوم ص۔37)

پروفیسر ناز قادری نے اردو ادب کی پرورش اپنے خون جگر سے کی ہے۔ اردو ادب کے حوالے سے ان کا جو کام ہے وہ بہت وسیع ہے۔ اصناف ادب کے کئی شعبوں میں انھوں نے اپنی ایک الگ ہی پہچان بنائی ہے۔

پروفیسر ناز قادری کی ادبی زندگی کا آغاز اس عہد میں ہوا جب ترقی پسند ادبی تحریک کا زور کم ہورہا تھا اور شمس الرحمٰن فاروقی کا انقلابی ادبی رسالہ ''شب خون'' سے جدیدیت کے ایک نئے باب کا آغاز ہورہا تھا'' ناز قادری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی ادب سے بھی اپنے ادبی رشتے کو استوار کیا اور ترقی پسند ادبی تحریک کی ایثار وقربانی اور اس ادبی تحریک کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا۔ جدیدیت کے بدلتے ہوئے رنگ روپ اور ادبی تحریکات ورجحانات کو بھی اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ انھوں نے بیک وقت شاعری، فکشن اور تنقید سے اپنے ادبی سفر کی شروعات کی۔ نظم 'انتظار' افسانہ 'اور زندگی مسکرانے لگی' اور تنقیدی مضمون 'اقبال بحیثیت قومی شاعر' 1962 کے آس پاس کا یہ زمانہ 1963 سے باضابطہ ان کی تحریریں رسائل و جرائد میں کثرت سے شائع ہونے لگیں۔ صنم، پٹنہ شمع ادب، سلطان پور، بیسویں صدی، دہلی میں شعرونثری تخلیقات شائع ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے اردو کی ادبی دنیا کے اُفق پر گہرے نقوش چھوڑتی گئیں اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ اردو کے نامور ناقدوں نے پروفیسر ناز قادری کی تحریروں کو اپنی تنقیدی نگارشات کا محور وکرمرکز بنایا۔ یہ وہ دور تھا جب اردو ادب پر فیض و فراق، جوش وجمیل، کرشن چندر بیدی عصمت وسہیل عظیم آبادی سے پروفیسر کلیم الدین احمد جیسی شخصیات کی حکمرانی تھی۔ ان کی تحریروں سے ناز صاحب نے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اپنی ادبی منزلوں کو ایک نئی سمت سے روشناس کرایا۔ یہ اہم بات ہے کہ طالب علمی کے زمانے ہی میں انھوں نے ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ انھوں نے اردو کی معروف اصناف ادب میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ بعض اصناف میں اپنی ایک محبوب و معتبر شناخت بنانے میں بھرپور کامیابی حاصل کی۔ ایک ہردل عزیز غزل گو ایک محبوب نعت گو، ایک مستند تنقید نگار، ایک معتبر محقق ایک مشہور افسانہ نگار وغیرہ کے علاوہ ایک مقبول ومعروف استاد کی حیثیت سے انھوں نے ایک نمایاں وممتاز مقام ومرتبہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست دنیا کے سامنے ہے جو مختلف یونیورسٹیوں، کالجوں اور مختلف شعبوں اور مختلف ممالک میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر ناز قادری کی اب تک درج ذیل کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

سحر البیان ایک مطالعہ (تنقید) 1971، دریافت (تحقیق وتنقید) 1985، لمحوں کی صدا (غزلیات) 1997، اردو ناول کا سفر (تاریخ و تنقید) 2001، زاویے (تحقیق وتنقید) 2007، چراغِ حرا (نعت پاک) 2009، صحرا میں ایک بوند (غزلیات) 2010، وہ ایک بات (افسانے) 2012، رنگ شکستہ (نظم وغزل) 2014، سلسبیل نور (نعت شریف) 2015

اس کے علاوہ پی ایچ ڈی کا گرانقدر تحقیقی مقالہ ''اردو ناول میں خواتین کا حصہ''، ڈی لٹ کا اہم مقالہ ''مرزا ہمایوں مرزا کی سماجی اور علمی خدمات''، ''اردو ہندی فکشن میں اساطیر اور لجنڈس''، ''اردو کی پہلی خاتون ناول نگار'' کے نام سے کتابیں اشاعت کے مرحلوں میں ہیں۔

''پروفیسر ناز قادری کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر شمشاد فاطمہ کے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی زیرِ اشاعت ہے۔ ناز صاحب کے کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین وشعری تخلیقات ہنوز رسائل وجرائد میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مقالات بھی ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکے ہیں۔ ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں کئی رسائل وجرائد کے گوشے اور نمبر بھی شائع ہوئے۔ کئی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی وتنقیدی مقالے قلم بند کیے جارہے ہیں۔

پروفیسر ناز قادری کی پہلی کتاب ''سحر البیان... ایک مطالعہ ہے۔ جو 1971 میں شائع ہوئی۔ ''سحر البیان'' کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا مگر اس تحقیقی وتنقیدی کتاب میں ''سحر البیان'' کی عظمت وادبی اہمیت کو ایک نئے سرے سے دریافت کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔ جس کتاب نے ناز قادری کو اردو تحقیق وتنقید کی دنیا میں محبوب ومعتبر بنانے کا کام کیا وہ ''دریافت'' کے نام سے 1985 میں شائع ہوئی ہے۔ اپنی دور رس نگاہیں، عمیق مطالعہ نے دریافت کو ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ''لمحوں کی صدا'' ناز قادری کی غزلوں کا دلکش وحسین مجموعہ ہے۔ 1997 میں شائع ہونے والی اس کتاب نے انھیں اردو شعرا میں ایک منفرد وممتاز شاعر کی حیثیت سے اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

عالمی شہرت یافتہ ماہرِ نفسیات وعروضیات پروفیسر عظیم الرحمٰن، پروفیسر ناز قادری کی شاعرانہ عظمت اور ادبی وعلمی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''یہ بھی غزلیں اپنی ہیئت میں پوری طرح روایتی ہیں جب کہ مواد میں داخلی کیفیات واحساسات کے ساتھ ساتھ جدید عصری معاملات وموضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ تقریباً تمام تر غزلیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ شاعر کو اپنے اندر کے معاملات واطراف کے حالات کا پورا پورا احساس ہے جس کے اظہار وترسیل میں وہ غزل کے مخصوص لہجے اور لفظیات کے استعمال میں قدرت کاملہ بھی رکھتا ہے۔

(ناز قادری، شعر، فکشن اور تنقید، جلد اول، صفحہ 150)

''لمحوں کی صدا'' کی تمام تر 56 غزلیں اپنے اندر پوری جاذبیت، ادبیت، معنویت اور تہہ داری وتازگی سے لبریز ہیں۔ ''اردو ناول کا سفر'' یہ اہم کتاب اور ناول کے حوالے سے ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے اور حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ اس کی ادبی وعلمی عظمت واہمیت مسلم ہے۔

'زاویے' پروفیسر ناز قادری کی تحقیق وتنقید کا نہایت ہی دلچسپ اور معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہے۔

''چراغِ حرا'' پروفیسر ناز قادری کا ایک ایسا نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے جس کی دلکشی وخوشبو دیر اور دور تک محسوس کی جائے گی۔ کلاسیکی وجدید رنگ و آہنگ کی آمیزش سے لبریز یہ نعت شریف کا خوبصورت، مجموعہ ناز قادری کو اس میدان میں نمایاں وممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ نامور جدید ناقد وشاعر پروفیسر ظفر انصاری ظفر، چراغ حرا کی عظمت پر اپنی گرانقدر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ناز قادری نے اپنی نعتیہ شاعری کے ذریعہ اس تصور کی حقیقت کو بھی فاش کرنے کی کوشش کی ہے جو عہد حاضر میں مسلمانوں کے تعلق سے رائج ہوا ہے۔ میڈیا کے ذریعہ اس خیال کی اشاعت کیا جانا کہ اسلام دہشت گردی کو روا سمجھتا ہے، ایک بے بنیاد بات ہے۔ جو لوگ اصل میں اسلام کے پیروکار رہے ہیں۔ انھوں نے شروع سے ہی اخوت ومحبت اور امن وآشتی کی تعلیم دی ہے، چنانچہ مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام تراشنا ایک نہایت ہی مذموم عمل ہے۔ جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے، کم ہے۔

(ناز قادری، شعر، فکشن اور تنقید، ص: 25، 224، جلد دوم)

''صحرا میں ایک بوند'' 2010 97 ستاون غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ ناز قادری کی غزلیہ شاعری کی جدید تاریخ میں ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔ تمام غزلوں میں زندگی اور زمانے کی کرب وکیفیت، درد وداغ، دکھ سکھ تمام پہلوؤں کو شاعر نے نہایت ہی خوبصورتی وخوش اسلوبی کے ساتھ غزلوں کا وسیلہ بنایا ہے۔ ایک منفرد ومخصوص لہجہ کے شاعر کی حیثیت سے عہدِ حاضر میں انھوں نے اپنا ایک الگ ہی مقام بنایا ہے۔ ''صحرا میں ایک

بونڈ" اردو غزل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

رنگ شکستہ (2014) نظم وغزل کا یہ دلکش مجموعہ پروفیسر ناز قادری کی ادبی وشعری بصیرت کا ایک ایسا نمونہ ہے، جس کی شعریت، ادبی نغمگی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

سلسبیل نور (2015) نعتوں پر مشتمل ایک ایسا ادبی وشعری کارنامہ ہے جسے نعت پاک کی تاریخ میں اپنا ایک بلند مقام حاصل ہے۔ عشق وعقیدت سے لبریز اس نعتیہ مجموعہ میں پروفیسر ناز قادری نے ایک نئی ادبی تاریخ رقم کی ہے، جسے ہم کسی طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ نامور ناقد و شاعر پروفیسر نجم الہدیٰ کے لفظوں میں:

> "ناز قادری کا نعتیہ سرمایہ گذشتہ چودہ پندرہ برسوں کے دوران کا ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنی توجہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا کی طرف مرکوز کی ہے اور یہ ان کی شاعری کے موضوعات ومضامین میں خوش آئند تبدیلی و اضافہ ہے۔ ناز قادری نعتیہ مضامین کے تنوع سے اکتسابِ فیض کرتے رہے ہیں اور شعر کی زمین (بجز قافیہ و ردیف) کے مطابق مضمون ڈھونڈ لاتے ہیں۔ اس کوشش میں فن کار کا صرف ذوق تفحص کام نہیں کرتا، بلکہ عشقِ رسول کا جذبۂ خالص بھی ان کی پشت پناہی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نقبِ صاحب لولاک اس وقت تک والہانہ نہیں ہوتی جب تک عشق رسول کا جذبہ بھی دل میں موج زن نہیں ہوتا، یہی وہ محرک ہے جس سے کامیاب نعت گو کامیابی وسرفراز کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ ناز قادری کے یہاں یہ عشق رسول فراواں ہے اور شاید یہی پروانۂ نجات ہو۔

(ناز قادری، شعر، فکشن اور تنقید، ص:61، جلد دوم)

پروفیسر ناز قادری کا وصف یہ ہے کہ وہ اپنے علمی وادبی سفر میں کئی تحریکات ور جحانات سے متاثر ضرور ہوئے، مرغوب کبھی نہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ ابتدائی تحریروں میں ترقی پسند ادب کے گہرے نقوش ملتے ہیں پھر جدیدیت کی طرف بھی وہ مائل نظر آتے ہیں مگر ان تمام باتوں اور صداقتوں کے باوجود انھوں نے اپنے مزاج ومیلان، معیار ووقار کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے ایک بھرپور علمی وادبی زندگی گذاری سیمیناروں اور مشاعروں میں اپنی ادیبانہ شان کو ہمیشہ ہی برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ اصنافِ ادب کے کئی شعبوں کو انھوں نے جلا بخشی اور ہر مقام ومنزل پر اپنے مخصوص لب ولہجہ اور اسلوب کو ایک نئی زندگی دی۔ زبان و بیان پر بے پناہ گرفت ان کی ادبی کامیابی کی علامت وضمانت ہے اور ان کا خاص طرۂ امتیاز بھی۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نئی نسلوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عصروں کو بھی اپنی جانب مبذول کیا یہ اپنے آپ میں ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ پروفیسر ناز قادری علمی، ادبی وشعری محفلوں کی جان تھے۔ انھوں نے بے غرض اردو زبان وادب کی جو خدمت کی ہے وہ اردو دنیا کے لیے باعث افتخار ہے۔

پروفیسر ناز قادری 3/ اکتوبر 1969 سے درس وتدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہوئے اور پروفیسر وصدر شعبۂ اردو کے علاوہ چیئر مین پی جی ریسرچ کونسل اور بورڈ آف اسٹڈیز بی آر اے بہار، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، ممبر سنڈیکیٹ اینڈ سنٹ بی آر اے بہار یونیورسیٹی، مظفر پور، ممبر بورڈ آف وشو بھارتی، شانتی نکیتن اور گورکھپور یونیورسٹی، ممبر بہار اردو اکادمی، ممبر آف اکسپرٹس ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسیٹی اورنگ آباد، مہاراشٹر، ممبر آف دی یو جی سی اکسپرٹس کمیٹی برائے گیارہواں۔ پنج سالہ منصوبہ، ممبر آف دی نیٹ ریویوٹیم یو جی سی، نئی دہلی وغیرہ۔

پروفیسر ناز قادری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں بہار اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی نے ان کی کتابوں پر انعامات دیئے۔ اعزازات میں امتیاز میر ایوارڈ، وجے شری ایوارڈ، شکشا رتن پرسکار، ایوارڈ آف امیریٹس فیلوشپ، یو جی سی، حسن عسکری ایوارڈ، اختر قادری ایوارڈ، راسخ عظیم آبادی ایوارڈ، ممتاز شیریں ایوارڈ، لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، رنگ منچ، کینڈا کے علاوہ درجنوں سرکاری غیر سرکاری اداروں کی طرف سے پروفیسر ناز قادری کو سرفراز کیا گیا۔ دوحہ قطر، سعودی عرب وغیرہ میں ان کی صدارت اعزاز میں کئی ادبی تقریبات منعقد کی گئیں اور انھیں سپاس نامے پیش کیے گئے۔

اردو زبان وادب کا یہ مایہ ناز ادیب 13/ نومبر 2019 کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا اور اردو دنیا ویران ہوگئی۔ وہ اپنے پیچھے علم ادب کا ایک ایسا خزانہ چھوڑ گئے جو ادبی دنیا کے لیے سرمایۂ حیات ہے۔

□□□

Dr. Gulshan Ara
W/o Dr. Khaliqur Rahman
Madrasa Road, Maripur,
Muzaffarpur - 842001 (Bihar)
Mob.: 7070223675, 9934635175

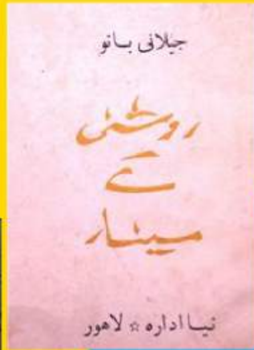

نوشین عثمانی

جیلانی بانو کی تخلیقی انفرادیت

آزادی کے بعد اُردو اُفق پر جن افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت قائم کی ان میں جیلانی بانو کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے ناول، ناولٹ، افسانہ اور ترجمہ کے علاوہ صحافت میں بھی اپنی جدت طبع کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے جہاں ان کا قلم تھکتا نظر نہیں آتا۔ اپنے مخصوص فکر وفن کی بنیاد پر نہ صرف معاصر افسانہ نگاروں میں نام پیدا کیا بلکہ آج بھی ان کی شہرت ومقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ ان کی تخلیقات قابلِ قدر اور فکر انگیز ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔

جیلانی بانو نے جب اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تو اس وقت ہندوستان زوال پذیر تھا، جاگیردارانہ سماج کی پرانی قدریں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوچکی تھی۔ اس کی جگہ نئی تہذیب نے لے لی تھی۔ پورے ملک میں افراتفری کا ماحول تھا۔ دوسری جنگِ عظیم اور اس کی ہولناکی کے اثرات نے ملک کی سماجی وسیاسی حالات کو بد سے بدتر کردیا تھا۔ اپنے ماحول میں جیلانی بانو نے ایک نئے راستے کا انتخاب کرتے ہوئے کسی سے متاثر ہوئے بغیر اپنے افسانے کی دنیا خود آباد کی جس کی بنیاد سماج اور حقیقتوں پر قائم تھی اور اپنے اس راستے پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ چلتی رہیں۔ وہ خود بیان کرتی ہیں :

> ''میں نے خاص طور پر کسی افسانہ نگار کو آئیڈیل نہیں بنایا نہ کسی دوسرے کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے جو لکھا وہ اپنے ہی طور پر اپنے ہی انداز میں لکھا ہے۔ جہاں افسانے کی فضا کا تعلق ہے تو فضا سب ہی مل جل کر بنارہے تھے اور اس فضا سے میں بھی متاثر ہوں گی۔ اصل میں مجھے مخصوص رایوں کے بجائے اپنے اردگرد ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں نے بہت ہی متاثر کیا ہے اور یہ تبدیلیاں اب بھی متاثر کرتی ہیں۔''

(مظہر جمیل۔ جیلانی بانو سے گفتگو، ماہنامہ ''طلوع افکار'' کراچی، مارچ 1997ء ص:21)

جیلانی بانو ایک دردمند دل رکھنے والی حسّاس اور ذہین خاتون ہیں۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ ان کی ادبی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں

ان کے ماحوال کا بڑا دخل رہا ہے۔ معاشرے اور سماج پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ان کے افسانوں میں ہر قسم کے احساسات، جذبات، مشاہدات اور تجربات کی عکاسی ملتی ہے اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ان کی تحریر ملتی ہے جس میں خاص طور سے عورتوں کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جس میں عورت کے مختلف روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گھر گرہستی کی الجھنوں میں اور جنس و رومان کی فضا میں ہر جگہ اس کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ان کے افسانوں میں بھی عورتوں پر کیے جانے والے ظلم و جبر کا برملا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے عورتوں پر کیے جانے والے دکھ درد کو جس طرح سے محسوس کیا ہے اسے انتہائی جذباتی انداز میں صفحہ قرطاس پر پیش کر دیا ہے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ عورتیں ضرورت سے زیادہ مردوں کے ظلم و جبر برداشت کرتی ہیں اور اس کے خلاف کوئی احتجاجی رویہ نہیں اپناتیں۔ انھوں نے عورتوں کی بے بسی کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے اور اس کے خلاف اپنے قلم کے ذریعے آواز بھی بلند کی ہے۔ان کا یہی عمل ان کی تحریر کی پہچان بن گیا۔ بقول انور سدید:

> "جیلانی بانو کا بنیادی موضوع عورت ہے۔ ان کے لیے یہ موضوع اتنا سدا بہار ہے کہ اس پر بیسیوں افسانے لکھنے کے بعد بھی جب وہ قلم اٹھاتی ہیں تو یہ موضوع تازہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے ایک ہی مضمون کو سو رنگ میں باندھا ہے بلکہ یہ کہ عورت کی زندگی اتنی کثیر الاضلاع ہے کہ جیلانی بانو کے ہر افسانے میں اس کا کوئی نیا زاویہ منظر پر اُبھرتا ہے اور افسانہ کسی سابقہ عمل کی تکرار نظر نہیں آتا۔"

(ڈاکٹر انور سدید، برسبیل تنقید، مقبول اکیڈمی شاہراہ قائد اعظم لاہور 1990، ص 182)

جیلانی بانو کے یہاں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ایک طرف جہاں ان کے زیادہ تر افسانوں کا موضوع نسوانی ہے وہیں دوسری طرف جاگیردارانہ نظام اور اس کی قدر و قیمت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "بات پھولوں کی" اور "گدھ" جیسے افسانوں میں موجودہ دور کے سیاسی حالات اور مکر و فریب کو ظاہر کیا ہے۔ان کے افسانوں میں حیدرآباد کی ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کے علاوہ پورے ملک کے مسائل کا بھرپور اظہار ہوا ہے، خواہ وہ عورتوں کے مسائل ہوں، یا پھر امیروں، حکمرانوں، جاگیرداروں کے ذریعے غریبوں اور مزدوروں پر کیے جانے والے ظلم ہوں۔ان تمام مسائل کو جیلانی بانو نے اپنی فنکارانہ صلاحیت کے ذریعے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا ہے اور اسی بنا پر ان کی تخلیقات خواتین کے درمیان نمایاں ہیں۔ اپنے پہلے افسانوی مجموعے "روشنی کے مینار" کے دیباچے میں وہ خود لکھتی ہیں :

> "اپنے پیچھے روایتوں کے جھلملاتے چراغوں کی ایک لمبی لڑی مجھے دکھائی دیتی ہے، جس نے مجھے لکھنا سکھایا، اپنے دیش کی ان ساری خوبصورت اور قابل یقین روایتوں پر مجھے بھی یقین ہے اور فخر بھی، جہاں سانپوں کو دودھ پلایا جاتا ہے۔ جہاں ہر قدم پر مندر ہے اور ہر محلے میں درگاہ ہیں۔ جہاں گائے کو ماں کہتے ہیں اور دیپک راگ سے آگ لگاتے ہیں۔ اگر میں غور سے دیکھوں تو میری افسانہ نگاری پر ان آریاؤں کی بھی چھاپ ہے جو نگر نگر علم و تہذیب کے چراغ جلاتے پھرے۔ ایران و عجم کی ثقافت بھی میرے خون کا جزو ہے جو میرے آباء واجداد اپنے ساتھ لائے تھے۔ اپنے پیچھے جانے پہچانے چہروں کا ہجوم ہے اور ارجن وکرشن، کالی داس، غالب، میر، اقبال، ٹیگور اور فیض یہ الگ الگ رنگوں کے پھول ایک جگہ کھلتے ہیں اور ان سب رنگوں کی چھینٹ میرے ذہن پر پڑ رہی ہے۔ میں نے ان سب کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ کتابیں بھی اور چہرے بھی۔ اپنے آس پاس کی فضائیں بھی اور تحریریں بھی جو لکھی نہیں جاتیں۔"

(دیباچہ مجموعہ "روشنی کے مینار" جیلانی بانو، نیا ادارہ لاہور 1958، ص 13)

جیلانی بانو کا مقصد یہ نہیں کہ مرد ہی عورت کی تباہی و بربادی کے ذمہ دار ہیں بلکہ وہ یہ باور کرانا چاہتی ہیں کہ اصل خرابی ہمارے معاشرتی نظام میں ہے جو عورتوں اور مردوں کو قیود میں پابند رکھتا ہے۔ دونوں اسی نظام کا شکار ہیں۔ عورت چونکہ کمزور حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس ظلم کا زیادہ نشانہ بنتی ہے۔ غرض سماج کے جاگیردارانہ نظام، مشترکہ کنبے کی روایت، قدامت پرستی اور سماج کے دیگر شعبوں میں عورتوں کو جن جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی کامیاب تصویریں اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں۔ان کے افسانوں کو پڑھ کر قاری کو نئے ماحول اور جداگانہ پیش کش کا احساس ہوتا ہے۔ فکری انتشار، جذباتیت اور تخریب سے ان کی تحریر آلودہ نہیں ہونے پاتی وہ جو بھی لکھتی ہیں طویل تجربے، مشاہدے اور راست مطالعے کی روشنی میں لکھتی ہیں۔

"موم کی مریم" جیلانی بانو کا ایک کامیاب اور مشہور افسانہ ہے۔ اس افسانے میں جیلانی بانو نے کثرتِ اولاد کی وجہ سے بے توجہی کی شکار ایک نوعمر لڑکی قدسیہ کی جنسی بے راہ روی کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔

قدسیہ کا تعلق ایک متوسط مسلم معاشرے کے اس خاندان سے ہے جہاں مشترکہ کنبے کی روایت اب تک برقرار ہے۔ اس گھرانے میں لڑکی پیدا ہونے پر خوشی کی علامت نہیں سمجھا جاتا۔ قدسیہ پیار و محبت کی بھوکی گھر میں ایک سامان کے مانند ہے اور یہی احساس تنہائی اس کے اندر بغاوت کا بیج بو دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ خودسر اور ضدّی بن جاتی ہے۔ قدسیہ کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک ماسٹر سے محبت کرتی ہے۔ اس کے بعد ماسٹر قدسیہ کے ساتھ بے وفائی کرتا ہے تو قدسیہ اپنے گھر میں کسی کو بتائے بغیر ایک دوسرے شخص اطہر سے شادی کر لیتی ہے اور خود کو موت کی آغوش میں ڈال کر اسے تمام بری خصلتوں سے پاک کر کے ایک شریف انسان بنا دیتی ہے۔ قدسیہ کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس نے مردوں پر بھروسہ کیا اور اس طرح اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ اس کہانی کے ذریعے جیلانی بانو نے عورتوں اور مردوں کی ذہنیت کو پیش کیا ہے۔

افسانہ ''مٹی کی گڑیا'' میں جیلانی بانو نے مردوں کی خودغرضی اور عورتوں کی وفاشعاری کو پیش کیا ہے۔ افسانہ میں خودغرضی، بے حسی، مفاد پرستی اور معدوم ہوتی انسانی اقدار کو دکھایا گیا ہے کہ چند پیسوں کی خاطر کس طرح بیوی کا محافظ سمجھے جانے والے اس قدر حیوانیت پر اتر آتے ہیں۔ اس افسانے کی ''درالکشمی'' اپنے تمام احساسات و جذبات کو قربان کر ''ملیشم'' سے شادی کر لیتی ہے تاکہ اس کی زندگی میں خوشیاں لا سکے لیکن بدلے میں اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا شوہر جس کی خاطر وہ سب کچھ قربان کر دیتی ہے محض ایک روپیے کے عوض اسے فروخت کر دیتا ہے۔ یہ کہانی درالکشمی کی زندگی کی ہی نہیں بلکہ درالکشمی جیسی بے شمار غریب عورتوں کی زندگی کی کہانی ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''اس کے پیروں کے نیچے کی زمین روئی کی طرح نرم ہو گئی تھی اور وہ اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ زندگی کی ساری مردہ اور نیم مردہ خواہشیں اس کے آس پاس ناچ رہی تھیں۔ اپنی لنگڑی ٹانگ کے بھروسے پر اتنا اونچا ہو کر وہ پریشان ہو گیا۔ ہاتھ بڑھا کر درالکشمی کا سہارا لینا چاہا مگر اس کا ہاتھ سو روپیے کے نوٹ پر جا پڑا۔ کرکراتا ہوا نوٹ جس پر ہاتھ پڑتے ہی درالکشمی کا ہیولا مدھم پڑنے لگا اور چونک پڑا جلدی سے چاروں طرف دیکھ کر کمرے سے بندھے ہوئے نوٹ کو ٹٹولا۔ اس پر ہاتھ پڑتے ہی کتنے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ جدھر دیکھو روشنی کے حلقے گھومنے لگتے ہیں۔''

(جیلانی بانو، تریاق (مٹی کی گڑیا) ناشر جوری نورانی مکتبہ دانیال، کراچی 1993، ص:41)

جیلانی بانو کے افسانے ''مٹی کی گڑیا'' سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں عورتوں کے استحصال، مجبوری، مظلومی اور بے چارگی کو موضوع بنایا ہے۔ اسی طرح ان کی ایک کہانی ''دیوداسی'' کی ملکہ بھی ہے۔ جس نے اپنی پوری زندگی اپنے شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری میں وقف کر دی لیکن بالآخر اسے ناکامی و محرومی نصیب ہوئی۔ افسانہ ''چھمیا'' اور ''سونا آنگن'' میں بھی اسی طرح کے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔

افسانہ ''نئی عورت'' کا موضوع بالکل مختلف ہے۔ اس افسانے میں بیسویں صدی کی عورتوں کی بہادری اور حوصلہ مندی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''نئی عورت'' کی نگما اپنے شوہر کا ظلم و جبر برداشت کرنے کے بجائے اس سے ٹکرانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ اپنے اوپر ہوئی ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ اپنے حقوق کے لیے سر اٹھا کر انصاف مانگتی ہے۔ جیلانی بانو نے اس طرح کے افسانوں میں عورتوں کے حوصلے اور اعتماد کو بلند رکھا ہے انھوں نے لڑکیوں کی نفسیات ٹٹول کر اس میں بلند حوصلگی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیشہ دردمندوں و مظلوموں کے ساتھ ہوتی ہیں اور اپنی کہانیوں کے ذریعے حساس قارئین کے ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں۔

الغرض جیلانی بانو اردو افسانے کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر چکی ہیں۔ ان کا منفرد مخصوص لہجہ اور انداز بیان کے ساتھ فکر کی آنچ انھیں اپنے ہمعصروں میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔ ان کے موضوعات سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی، تاریخی، تہذیبی ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ انھیں زندگی کے مسائل کا شدید احساس ہے اور انھیں پیش کرنے کا تخلیقی ہنر بھی۔ سوچ میں بالیدگی اور فکر میں گیرائی و گہرائی ہے۔ زبان پر بے پناہ قدرت ہے اور الفاظ ذخیرہ اور جملوں کا برمحل استعمال جیلانی بانو کو خوب آتا ہے۔ ان کی یہی حقیقت پسندی ان کی پوری افسانوی کائنات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

□□□

Ms. Nausheen Usmani
Building Mohak oyster
Living 1
Naigaon East
Mumbai- 401208 (U.P)
Mob. 8265899647

ڈاکٹر رابعہ ناز

'بستی' کا نسائی تجزیہ

'بستی' ایک ایسی جگہ، جہاں مختلف جگہوں سے آ کر بسے لوگ ایک ساتھ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناول کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایک عام دنیا کا قیام کیسے کیا جائے جو سب کے لیے ایک جیسی ہو، وہ کون سی وجوہات ہیں جو انسان کو ساتھ رکھتی ہیں اور وہ کون سی وجوہات ہیں جو انھیں جدا ہو جانے پر مجبور کرتی ہیں۔ انتظار حسین کا ناول 'بستی' ان ہی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ناول 'بستی' میں قیام پاکستان کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ وہاں کی بدحالی اور بدامنی کو مرکز بنایا گیا ہے۔ پاکستان کی خانہ جنگی اور پھر قیام بنگلہ دیش کا ذکر ہے۔ کرداروں کو نوسٹالجک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے ذہن میں ہندوستان اور تقسیم مسلسل موجود ہے۔ ذاکر ناول کا مرکزی کردار ہے۔ وہ لاہور کے ایک کالج میں تاریخ کا لکچرر ہے۔ ذاکر کا مطلب ہے یاد کرنے والا اور یہ کردار اپنے نام کے عین مطابق ہے۔ اس کے ذہن میں ہر وقت گزرا ہوا زمانہ، اس کے بچپن اور جوانی کے قصے، روپ نگر اور ویاسپور تمام موجود رہتے ہیں۔ اپنے ماضی کے نقوش وہ اپنی موجودہ زندگی میں تلاش کرتا ہے۔

اس ناول کے نسوانی کرداروں میں 'صابرہ' کا کردار خود 'بستی' کے کرداروں اور اردو کے دوسرے ناولوں کے نسوانی کرداروں سے مختلف ہے۔ صابرہ کا کردار ایک جدید اور بولڈ لڑکی کا کردار ہے۔ صابرہ ایک ایسی لڑکی ہے، جس کے بارے میں محض اتنا کہہ دینا ہی حیران کن ہے کہ اس نے اپنے تمام رشتہ داروں کے پاکستان ہجرت کر جانے کے کے بعد بھی ہندوستان چھوڑ کر جانا گوارا نہیں کیا۔ ہندوستان میں تنہا رہ جانے والی یہ لڑکی اپنے آپ میں ایک عجوبہ ہے۔ جس کا ذکر ذاکر کا ایک دوست سریندر اپنے خط میں کرتا ہے۔

انتظار حسین نے صابرہ کی شکل میں جدید عورت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ایک روایتی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس نے اپنی زندگی سے متعلق فیصلے خود کیے۔ صابرہ کا کردار نہ تو قرۃ العین حیدر کے elite کلاس سے تعلق رکھتا ہے اور نہ ہی عصمت کی بے باک قلم کی اپج ہے۔ اس کے قدموں میں روایت، عزت، خاندانی وقار، جیسی ساری بیڑیاں ہیں۔ اس کے باوجود وہ نوکری بھی کرتی ہے اور ہندوستان میں تنہا رہ جانے کا فیصلہ بھی کرتی ہے۔

ناول کا پروٹا گونسٹ ذاکر، پہلے روپ نگر پھر ویاس پور اور اس کے بعد اپنے والدین کے ساتھ پاکستان چلا جاتا ہے اور ہندوستان میں اپنا خوبصورت بچپن اور اپنی بچپن کی محبت صابرہ کو چھوڑ جاتا ہے۔ ناول میں ذاکر کی زندگی کے کچھ مہینوں کو کینوس پر پیش کیا گیا ہے لیکن ان چند مہینوں میں تمام اسلامی تاریخ، دیومالائی قصے، ذاکر کا بچپن 1857 کی دہلی اور صابرہ کی یادیں سب کچھ منظر عام پر آ جاتے ہیں۔ صابرہ ذاکر کے ذہن میں تمام یادوں کے ساتھ ہمیشہ موجود رہی۔ ذاکر ایک خیالی دنیا میں رہنے

والا اور واقعات کو fantasies کرنے والا شخص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور میں ذاکر کا دوست عرفان، صابرہ کے قصے کو بھی ذاکر کے تصور کی اپج سمجھتا تھا:

"عرفان نے شروع سے آخر تک احتیاط سے پڑھا۔ وہ خط پڑھ رہا تھا اور ذاکر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کے ردعمل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خط پڑھ چکنے کے بعد عرفان ہنسا 'یار میں سمجھتا تھا کہ صابرہ تمہارے ناسٹولجیا زدہ تخیل کا فتور ہے۔ مگر وہ تو سچ مچ وجود رکھتی ہے۔'"

[بستی: صفحہ135]

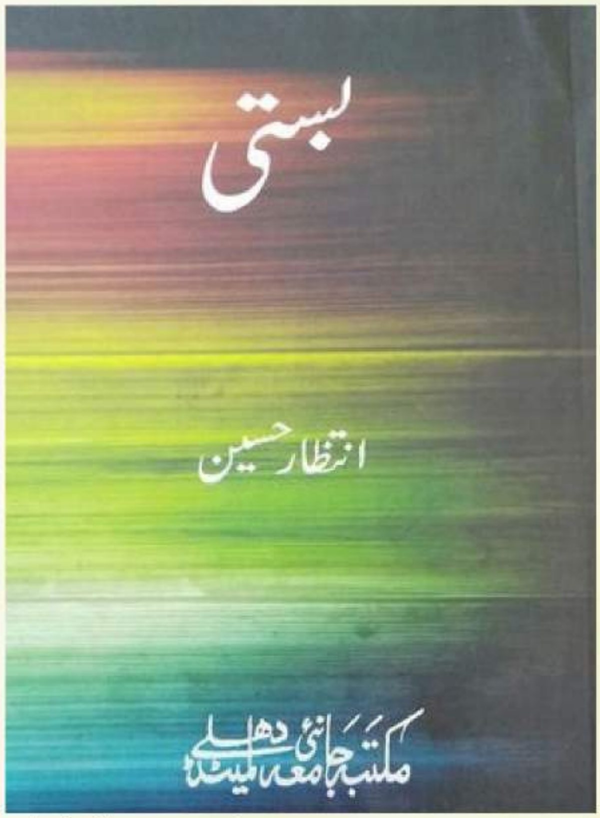

ہندوستان سے آنے والے سریندر کے خط نے صابرہ کو ذاکر کے unconscious ذہن اور ماضی سے نکال کر حال میں لا کھڑا کیا تھا۔ صابرہ ذاکر کی خالہ کی بیٹی ہے۔ خالہ پہلے اپنے شوہر، دو بیٹیوں طاہرہ اور صابرہ کے ساتھ گوالیر میں رہتی تھی۔ لیکن شوہر کی اچانک موت کے بعد خالہ اپنی بیٹیوں کو لے کر اپنی بہن کے پاس روپ نگر آ جاتی ہیں۔ تب سے ذاکر کی دوستی صابرہ کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جلد ہی روپ نگر سے زمین داری اور اپنا اثر ورسوخ ختم ہوتا دیکھ کر ذاکر کے والد کا دل وہاں نہیں لگتا اور وہ اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ ویاس پور چلے جاتے ہیں۔ مگر خالہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ روپ نگر میں ہی رہ جاتی ہیں۔ ذاکر اور صابرہ کی دوبارہ ملاقات تب ہوتی ہے جب وہ کالج میں داخل ہو جاتا ہے اور روپ نگر گھومنے کے لیے آتا ہے۔ ویاس پور میں جب صابرہ ذاکر کے گھر گئی ہوتی ہے تب ذاکر اس سے کہتا ہے کہ وہ جلد ہی دلّی میں نوکری کرے گا اور پھر صابرہ اور ذاکر وہاں ساتھ میں رہیں گے۔ مگر تقسیم نے ایسا کچھ ہونے نہیں دیا اور ذاکر اپنے والدین کے ساتھ پاکستان چلا گیا۔ طاہرہ اپنے شوہر کے ساتھ ڈھاکہ چلی گئی۔ وہاں جا کر وہ اپنی ماں اور صابرہ کو بھی اپنے پاس بلانا چاہتی ہے مگر صابرہ کو شادی کرنے اور ملک چھوڑنے دونوں سے انکار تھا۔ آخر کار صابرہ کی ماں اکیلی طاہرہ کے پاس ڈھاکہ چلی جاتی ہیں۔

تقسیم کے بعد صابرہ دلّی میں مقیم ہو گئی اور ریڈیو میں نوکری کرنے لگی۔ وہی دلّی جہاں اس نے اور ذاکر نے ساتھ رہنے کا خواب دیکھا تھا۔ صابرہ دلّی میں ہے اس بات کی خبر ذاکر کو اس کا دوست سریندر دیتا ہے۔ سریندر خود ریڈیو میں کام کرتا تھا۔ سریندر کے مطابق اس نے اسی ریڈیو محکمے میں کام کرنے والی ایک عجیب لڑکی کو دیکھا۔ صابرہ کے تمام رشتہ دار ہندوستان چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ ان سب کی خیریت جاننے کو بے چین رہتی، اور روز ڈھاکہ کی خبریں جاننے کی کوشش کرتی ہے تاکہ خطوں کا جواب نہ آنے پر خبروں کے ذریعہ کم از کم حالات کا اندازہ ہو سکے۔ لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ ذاکر پاکستان میں رہتا ہے، صابرہ کبھی وہاں کے حالات جاننے کی کوشش نہیں کرتی نہ وہاں کسی کو خط لکھتی ہے۔ سریندر اکثر صابرہ سے اس کے اور ذاکر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر اس نے اس معاملے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔

ناول نگار نے صابرہ کو آزاد ہند کی جدید عورت کی شکل میں پیش کیا ہے جو اپنے فیصلے خود لیتی ہے اور خود مختار ہے۔ اس نے جس سے محبت کی اسے آزاد چھوڑ دیا۔ کبھی اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنی۔ یہاں تک کہ وہ ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ حالات نے انھیں جدا کر دیا تھا۔ تقسیم کا ہونا اور اپنے گھر والوں کو ملک چھوڑ کر جانے سے روکنا ان دونوں کے قابو میں نہیں تھا۔ مگر خود کو روک لینا ان کے اختیار میں تھا۔ صابرہ نے وہی کیا۔ اپنی قسمت کا فیصلہ اس نے خود کیا لیکن ذاکر نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور خود کو وقت کے دھارے میں بہہ جانے دیا۔

ہندوستان سے تمام خاندان ہجرت کر گئے تھے۔ خود صابرہ اور ذاکر کے خاندان اس بات کی مثال ہیں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ ایک لڑکی نے جانے سے انکار کیا ہو اور وہ ہندوستان میں تنہا رہے۔ سریندر کے مطابق اپنے پورے کنبے کے چلے جانے کے باوجود ہندوستان چھوڑ کر

نہیں جانے والوں میں بوڑھے بزرگ ہی تھے جو یا تو جانے کی حالت میں نہیں تھے یا جن کو ان کی زمین کی محبت نے جانے نہیں دیا تھا۔ان بزرگوں کی آخری خواہش اپنی موت کے بعد اپنی زمین میں دفن ہونے کی تھی۔لیکن صابرہ کا جانے سے انکار کر دینا سریندر کو حیران کرتا ہے اس کی وجہ جب اس نے صابرہ سے پوچھی تو اس کا جواب تھا:

''پھر یہ کہ میں پاکستان چلی بھی جاتی تو کیا فرق پڑتا۔میں پاکستان میں بھی اکیلی رہتی۔'' [بستی،صفحہ124]

صابرہ کی زبان سے نکلے یہ جملے اس کے اور ذاکر دونوں کے حالات کے ترجمان ہیں۔ذاکر پاکستان میں اپنے والدین اور دوستوں کے درمیان رہ کر بھی اپنی یادوں کے جنگل میں تنہا سفر کرتا ہے اور صابرہ ہندوستان میں اکیلی ہے۔فرق بس اتنا ہے کہ وہ اندر سے کھوکھلی نہیں ہے جبکہ ذاکر اور اس کے سارے دوست اندر سے کھوکھلے ہیں۔

صابرہ کا ذکر جب ذاکر اپنی ماں سے کرتا ہے تو وہ غصے میں آ جاتی ہیں۔صابرہ اور ذاکر کی ماں میں ایک نسل کا فاصلہ ہے۔صابرہ جن حالات سے گزری ہے انھیں سمجھنا ذاکر کی امی کے لیے مشکل ہے۔ذاکر کی ماں ایک سیدھی سادی عورت ہیں جن کے لیے محض اپنے شوہر کی تابعداری ،ان کا مذہب اور مذہب کے مقرر کردہ اصولوں کو قائم رکھنا ہی سب کچھ ہے۔امی ایسی عورت ہیں جنھوں نے کبھی سوال کرنا نہیں سیکھا۔تقسیم کا المیہ انھوں نے بھی برداشت کیا لیکن ان کے اندر بھی اپنی زمین سے دور ہو جانے کا ہی کرب تھا۔وہ صابرہ کے اس بااختیار رویے کو سمجھ نہیں سکتیں جو اس نے ایک نوکری پیشہ عورت کے طور پر اپنایا ہے،یعنی اپنے فیصلے خود لینے اور خود اعتمادی کے ساتھ زندگی گزارنے کا رویہ۔ذاکر جب صابرہ کا نام لیتا ہے تو امی کہتی ہیں:

''وہ تو بہت ہی خودسر لڑکی نکلی'' امی نے وضاحت کی'' اول تو میں پوچھوں ہوں کہ جب سارا خاندان ہی وہاں سے چلا آیا تو وہ وہاں کیوں رکی۔ارے وہ یہاں آ جاتی تو اس کا کوئی نہ کوئی ٹھکانہ ہو ہی جاتا۔خاندان ہی میں کہیں کھپ جاتی۔وہاں کنواری بیٹھی ہے اور گو کھا رہی ہے۔اچھا اگر وہاں رہی تھی تو حویلی کا کچھ خیال رکھتی۔بتول نے اسے کتنی تاکید کی تھی، میں نے بھی اسے خط لکھا کہ بٹی محرم کے دس دنوں کے لیے وہاں کا ایک پھیرا لگا لیا کر کہ امام باڑے میں چراغ جل جایا کرے اور علم کھڑے ہو جایا کریں،مگر اس خدا کی بندی نے وہاں ایک دفعہ جو جا کے جھانکا ہو۔آخر کو شرنارتھی وہاں آ کے بیٹھ گئے۔اب ملے گا وہاں اسے ٹھینگا ورنہ اکیلی گھر کی مالک ہوتی۔یہاں سے کون حصہ بٹانے جا رہا تھا۔'' [بستی،صفحہ130]

امی کی نظر میں صابرہ خودسر لڑکی ہے۔امی کا کہنا اس لحاظ سے بالکل درست ہے کہ آج کے زمانے میں بھی ایسے لوگ یا بوڑھے بزرگ موجود ہیں جو پرانی روایتوں کے علم بردار ہیں اور ان میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں چاہتے ،ان کی نظروں میں ہر بااختیار لڑکی خودسر ہے۔وہ لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کی شادی کیے بنا بھی ایک لڑکی زندگی جی سکتی ہے اور ایسی زندگی جینے کا اسے پورا حق ہے۔شادی کرنا زندگی کی کئی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہو سکتی ہے مگر شادی زندگی نہیں ہے۔امی کی نظروں میں لڑکی کا شادی کیے بنا زندگی گزارنا ایک ناقابل یقین عمل ہے۔ان کے مطابق اگر صابرہ پاکستان آ جاتی تو وہاں اس کا کوئی نہ کوئی ٹھکانا ہو جاتا۔یہاں ٹھکانے سے مراد صرف اور صرف شادی ہے۔شادی کرنا (لڑکی کی شادی) اس لیے ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ اسے تحفظ حاصل ہو سکے۔یہ تحفظ دو طرح کے ہیں۔ایک اقتصادی معاملے میں اور دوسرا ایک محافظ کا موجود ہونا ایک شوہر کی صورت میں۔ایک مرد کے زیر سایہ میں رہ کر ملنے والا یہ تحفظ اسے دوسرے مردوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔پہلی قسم کا تحفظ یعنی آمدنی کا ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے لڑکی کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے شادی کا کرایا جانا ایک آسان طریقہ ہے۔لیکن جب لڑکی خود برسرِ روزگار ہے تو اقتصادی مسئلہ تو خود بہ خود حل ہو جاتا ہے۔یہاں شادی کی ضرورت ثانوی درجے کی ہو جاتی ہے۔ایک نوکری پیشہ لڑکی اگر شادی کرے گی تو وہ اقتصادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک رفیق اور ہم سفر کے لیے کرے گی، companionship کے لیے کرے گی۔اور تب وہ شخص ایسا ہوگا جو اس کے معیار پر پورا اترے گا یا جس کے ساتھ ذہنی وابستگی ہوگی۔صابرہ کے معاملے میں پہلا مسئلہ تو تھا ہی نہیں کیوں کہ وہ نوکری پیشہ تھی،لیکن جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کا خواب دیکھا تھا وہ شخص اب بہت دور ہو چکا تھا اور دوسرے کسی ایسے شخص کا صابرہ کی زندگی میں گزر نہیں ہوا جس کے لیے وہ محسوس کر پاتی کہ اسے شریک سفر بنا سکے۔ساری بات یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

صابرہ نے معاشرے کی ان بندشوں کو بھی توڑا ہے جو محبت اور اخلاق کے نام پر عورت سے وابستہ ہیں۔مثال کے طور پر معاشرے نے عورت کے ذہن کو گھر،شوہر اور بچے کی فکر سے اس قدر جوڑ دیا ہے کہ وہ ان کو ہی اپنی زندگی کا مقصد اور پروجیکٹ مانتی ہے۔شادی، بچے،اپنے فیصلوں اور کریئر کو چننے کے درمیان اسے کئی طرح کے conflict اور

barriers کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ تر عورتیں ایسا سمجھتی ہیں کہ ambitious ہونا اور خود کو ترقی یافتہ کرنا یا اپنے talent کو بڑھانا، جو صرف ان کا ذاتی ہوتا ہے، انھیں خود غرض ثابت کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنی ذاتی پسند کو دوئم درجے میں شمار کرتی ہے۔ اکثر عورتیں اس طرح کی ذہنی الجھنوں کا سامنا کرتی ہیں کہ وہ اپنی خواہشات یا پسند کو اولیت کا درجہ کیسے دے سکتی ہیں جبکہ ان کی تمام زندگی رشتوں کو اہمیت دینے پر منحصر کرتی ہے اور جو عورت کے تئیں ایک ان کہی حقیقت ہے کہ اس کی اپنی زندگی ثانوی درجے کی ہوتی ہے۔

سریندر صابرہ کو ہندوستان میں اکیلی رہ جانے والی اور تاریخ کا عجوبہ بتاتا ہے:

"تم لوگوں کی تاریخ ہندوستان میں عجیب او بڑکھابڑ چلی ہے۔ پہلے تمہارے فاتحین آئے اور اس زور شور سے آئے کی ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہاں کی زمین ہل گئی اور تلواروں کی جھنکار سے فضا گونج اٹھی۔ پھر سیاسی رہنما نمودار ہوئے اور انھوں نے اپنی گھن گرج دکھائی۔ بابر، اکبر، شاہجہاں، اورنگ زیب۔ پھر سر سید احمد خان، مولانا محمد علی، محمد علی جناح اور ان سب کے بعد تمہاری صابرہ۔"

[بستی، صفحہ 135]

اس کے بعد وہ کہتا ہے:

"بھرے ہندوستان میں اکیلی رہ جانے والی ایک اداس خاموش لڑکی۔ پتہ نہیں یہ تمہاری تاریخ کا کمال ہے یا تہذیبوں کی تاریخ ہی اسی طور پر چلتی ہے۔ شمشیر و سناں اول۔۔۔ اور آخر؟" [بستی، صفحہ 135]

یہاں وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مصنف نے شمشیر اور سناں کے بعد آخر کہہ کر سوالیہ نشان کیوں لگا دیا۔ مصنف نے خود سیاسی رہنماؤں کے نام گنوانے کے بعد آخر میں صابرہ کا نام لیا ہے اور اس کے ساتھ خاموشی اور اداسی کو جوڑا ہے۔ یہ تمام فاتحین مرد تھے اور صابرہ یہاں عورت کی نمائندگی کر رہی ہے۔ مرد، وہ جو ہمیشہ سے فاتح رہا، اور عورت، جو ہمیشہ مظلوم رہی اور جب مظلوم نہیں تھی تو مرد کے بنائے اصولوں کو قائم رکھنے والی اور اس کی فتح میں شریک کرائی جاتی رہی۔ مگر فاتح مرد ہی رہا اور اس فتح کے نتیجے میں عورت کے حصے میں اداسی، خاموشی اور کرب آتے رہے۔

صابرہ نے اسی روایت کو توڑا ہے۔ اس کے حالات نے، محبت کے تئیں اس کے جذبے کی شدت نے یا تقسیم ہند نے، ان سب نے مل کر اسے اپنی ذات کے حوالے سے اتنا بڑا فیصلہ کرنے کی ہمت دی ہو، لیکن اس نے ذاتی طور پر یہ فیصلہ کیا۔ اس نے ہندوستان میں اکیلی رہ جانے کا فیصلہ کیا۔ عورت خود اپنی وضاحت اپنے سے جڑے رشتوں سے کرتی ہے۔ انھیں رشتوں سے وہ خود کو معاشرے کے بنائے اصول وضوابط پر پرکھتی رہتی ہے، معاشرے کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کرتی ہے اور معاشرہ بھی اسے پرکھتا رہتا ہے۔ صابرہ نے اس بندش سے خود کو آزاد کر لیا ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ عورت نے اپنے گھر، شوہر اور بچوں کا خیال رکھا، دیکھ بھال کی اور دوسرے ضروری رشتوں کو پنپنے میں مدد کی۔ ان تمام طرح کی باتوں سے باہر آنا اور ایک مختلف فیصلہ لینا جس میں کسی کی رضامندی شامل نہ ہو، ہمت کی بات ہے۔ کیونکہ اس فیصلے کے غلط ثابت ہونے پر اس کے نتیجے کو بھگتنے والی صابرہ اکیلی ہوتی۔ اس کے باوجود اس نے ایسا کیا۔ ایسا کرنے والی عورتیں اکثر احساس جرم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ انھوں نے اپنے فیصلے کو اہمیت دی۔ صابرہ میں ایسا کوئی احساس نہیں ہے لیکن اسے اپنی ڈھاکہ میں رہ رہی ماں اور بہن کی فکر ہے۔ صابرہ نے کبھی پاکستان میں رہ رہے ذاکر کی خبر لینے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہی شخص تھا جس کی وجہ سے اس نے ہندوستان نہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ان تمام باتوں کی وجہ سے صابرہ کا کردار اپنے آپ میں ایک مختلف کردار ثابت ہوتا ہے۔ اس کا مختلف ہونا ذاکر کی روایتوں کی پابند امی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ انہیں یہ عمل دردسر لگتا ہے کیونکہ وہ وہی عورت ہیں جو گھر اور رشتوں کو اولیت دیتی ہیں۔ صابرہ نے جس زندگی کا انتخاب کیا ویسی زندگی مرد اکثر جیتے ہیں۔ یعنی ہر رشتے سے آزاد ہو کر جینا۔ ہر بندش سے آزاد ہو کر جینا۔ جب مرد ایسا کام کرتا ہے تو وہ intellectual کہلاتا ہے، معاشرے میں موجود پریشانیوں کو دریافت کرنے والا اور ان کا حل تلاش کرنے والا سمجھا جاتا ہے اور جب عورت یہی زندگی جیتی ہے تو Single Woman کہلاتی ہے اور کہانی کا کردار بنتی ہے۔

□□□

Dr.Rabia Naz

CIL, JNU

New Delhi-110067

Email:rabia.naz3@gmail.com

Mob.9968158400

محمد اویس سنبھلی

عطیہ بی

اور ان کی کہانیاں

محترمہ عطیہ بی سے باقاعدہ ملاقات محمد سلمان صدیقی کے توسط سے 2014 میں ہوئی۔ سلمان صاحب قیصر باغ میں کمپوزنگ اور ڈیزائننگ کا کام کرتے تھے۔ عطیہ بی اپنی کہانیوں، مراسلات و دیگر ادبی مضامین کی کتابت کے سلسلہ میں اکثر وہاں جایا کرتی تھیں۔ کسی روز اس کم علم کا ذکر خیر بھی مراسلات و دیگر ادبی مضامین کی اشاعت کو لے کر سلمان صاحب کے آفس میں ہوا، جس کے سبب یہ حادثہ پیش آیا کہ عطیہ صاحبہ سے ہماری باقاعدہ ملاقات ہوگئی۔ حالانکہ اس سے پہلے لکھنؤ کی متعدد ادبی محفلوں میں انھیں دیکھ چکا تھا اور انھیں جانتا بھی تھا۔ یہ ملاقات شاید اتنی زیادہ نہ ہوتی اگر سلمان صاحب نے 2015 میں اپنا پورا آفس میرے پریس (نعمانی پرنٹنگ پریس۔ لکھنؤ) میں منتقل نہ کر دیا ہوتا۔ سلمان صاحب ہمارے انتہائی بے تکلف دوست ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے۔ میں اکثر ان کی شخصیت کے بارے میں کہا کرتا ہوں کہ فی زمانہ ایسے لوگ ملنے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہیں لیکن ان کے اندر ایک بڑی خامی یہ ہے کہ وہ پریس میں پابندی سے بیٹھنے کے سلسلہ میں کمزور واقع ہوئے ہیں لہٰذا ان کی غیر موجودگی میں اگر کبھی عطیہ صاحبہ کا آنا ہوتا تو مجھے ہی انھیں اٹینڈ کرنا پڑتا۔ اسے بھی حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ سلمان

صاحب سے عطیہ بی کی ملاقات طالب علمی کے زمانے میں ہمارے ہاسٹل کے ایک ساتھی جناب عبدالرب نے کرائی تھی۔ کچھ عرصہ قبل تک عبدالرب صاحب کمپوزنگ کے لیے پریس آتے رہے ہیں اور عطیہ بی صاحبہ بھی اپنی کہانیاں سلمان صاحب سے ہی کمپوز کراتی ہیں۔ القصہ مختصر! عطیہ بی کہانیاں لکھتی رہیں اور ہماری ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں کہ ایک وقت وہ آیا کہ انھوں نے اپنی کہانیوں کو یکجا کر کے کتاب شائع کرنے کا ارادہ کرلیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے ان کی کہانیوں کا مجموعہ 2017 میں ''امیدوں کا شجر'' نام سے شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ بیس کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں کی پذیرائی کرنے والوں میں محترم احمد ابراہیم علوی، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، ڈاکٹر صبیحہ انور اور محترم منظور پروانہ جیسی اہم شخصیات شامل ہیں۔ ان شخصیات کے حوصلہ بخش جملے عطیہ بی کے لیے کسی سند سے کم نہیں۔ ممتاز افسانہ نگار وصحافی احمد ابراہیم علوی نے عطیہ بی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کی کہانیوں کے دلچسپ انداز اور زبان کی سادگی پر مبارک باد پیش کی ہے۔

بچے کسی بھی معاشرے کا سب سے اہم رکن ہوتے ہیں کیونکہ مستقبل میں یہی بچے قوم کے معمار بنتے ہیں۔ ملک وقوم کی باگ ڈور انھیں ہی سنبھالنی ہوتی ہے۔ بچوں کا دل و دماغ پاکیزہ اور کورے کاغذ کے مانند ہوتا ہے۔ اس پر کچھ بھی آسانی سے نقش کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ہم انھیں جس طرف مائل کریں گے وہ اسی طرف ہوجائیں گے۔ بقول ڈاکٹر صبیحہ انور ''بچوں کا ادب وقت کی اہم ضرورت ہے اور مشکل بھی کیونکہ عمر کا یہی دور بچے کو ادب، زبان اور تہذیب سے متعارف کراتا ہے۔ اس عمر کا ہر نقش صاف سلیٹ پر کھینچی ہوئی لکیر کی طرح حافظے کی تختی پر ہمیشہ جگمگاتا رہتا ہے''۔ خود عطیہ بی کی تمام تر پرورش و پرداخت جس ماحول میں ہوئی وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا ایک خوبصورت ماحول تھا۔ اسی ماحول کا اثر ان کی کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔ احساس، انسانیت کا درد، دل جوئی، ہمدردی اور رواداری یہ ساری خوبیاں ان کے مزاج کا حصہ ہیں۔ حضرت جوش کی آخری یادگار ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے اپنے مضمون 'امیدوں کا شجر.... ایک نظر'' میں محترمہ عطیہ بی کی انھیں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''لیجئے! عطیہ بی بھی کہانی کار ہوگئیں، مجھے تو پہلے ہی سے شبہ تھا کہ یہ تیز آواز اور تیز دماغ کی لڑکی کوئی نہ کوئی گل کھلا کر رہے گی۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ ہر محفل ہر مباحثے، ہر ادبی معرکے، تعزیتی جلسے اور اجراء کی محفلوں میں عطیہ بی کی موجودگی کا یہی نتیجہ تو نکلنا ہی تھا کہ ''امیدوں کا شجر'' پھلے پھولے، سو وہی ہوا کہ اس شجر پر 20 رشیریں پھل نظر آنے لگے اور عطیہ کہانی کار ہوگئیں۔ عطیہ مذہبی اور اردو ماحول کی پروردہ ہیں، صاف وشفاف رنگت کی طرح دل بھی صاف ہے اور دماغ میں بھی کثافت نہیں ہے۔ پھولوں کی طرح مہکتی اور چڑیوں کی طرح چہکتی یہ کم عمر ادیبہ لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بہت ہی مقبول اور پسندیدہ ہے۔ بزرگوں کا احترام، ہم عمروں سے دوستی اور چھوٹوں سے پیار عطیہ کی فطرت ہے اور یہی فطرت ان کی کہانیوں میں بھی نمایاں ہے۔''

یہی پیار، محبت اور شفقت کہانیوں کے قالب میں ڈھل کر صفحہ قرطاس پر بکھر گئی اور بچوں کے لیے ایک متجسس دنیا قائم کرگئی۔ اس لحاظ سے عطیہ بی کو ادب اطفال کے زمرے میں جگہ مل گئی۔ ادب اطفال یعنی بچوں کا ادب۔ یہ ادب نہایت باریک بینی اور وسعت نظری کا طالب ہے جو عرق ریزی اور مشکل کشا کام ہے۔ اس میں ہر عمر کے بچوں کی سطح کے پیش نظر تحریریں لائی جاتی ہیں۔ جس سے بچوں کی ذہنی نشوونما بھی ہوسکے اور ان کی عمدہ تربیت کے ساتھ ان کے اندر اخلاق حسنہ بھی مدنظر آجائیں۔ اس کے لیے عام فہم، سادہ اور سلیس زبان کا بھی خیال رکھنا بدرجہ اتم ہے۔ محترمہ عطیہ بی کے سلسلہ میں ممتاز فکشن نگار وادیبہ محترمہ ڈاکٹر صبیحہ انور لکھتی ہیں:

> ''عطیہ بی کی بچوں کے لیے لکھی کہانیاں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ عطیہ بی کی تحریریں سلجھے ذہن اور سلیس زبان میں بات کرتی ہیں۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جو ایک اخلاقی پیغام ساتھ لے کر چلتی ہیں.... اخلاقی پیغام نازک کام ہے... عطیہ بی بخوبی جانتی ہیں کہ کہاں اخلاق کا درس روکھی پھیکی نصیحت بن کر معصوم ذہن پر بوجھ بن جاتا ہے۔ ''امیدوں کا شجر'' عطیہ بی کی پہلی کاوش ہے اور اس میں ایسی کہانیاں شامل ہیں جو آپ اپنے بچوں سے بار بار پڑھوائیں گے۔''

ادب اطفال کا آغاز اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوچکا تھا۔ اس کے بعد یہ روایت مستحکم ہوتی گئی، اس وقت محض تفنن طبع کے لیے اس کا آغاز ہوا تھا لیکن انیسویں صدی میں بچوں کی ذہنی قوت اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کہانیاں قلم بند کی جانے لگیں، بچوں کے لیے اعلیٰ پائے کے ادبا نے قلم اٹھائے جن میں اکبر الہ آبادی، محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین

حالی، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، عصمت چغتائی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر سیفی پریمی، مصداق فاطمہ، کرشن چندر، اسماعیل میرٹھی، قرۃ العین حیدر، جمیل جالبی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ فہرست انتہائی طویل ہے۔ موجودہ عہد میں، ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف، مرتضی ساحل تسلیمی، پرویز انیس وغیرہ اس فہرست کا حصہ ہیں۔ ابھرتے ستاروں میں ایک اہم نام محترمہ عطیہ بی کا بھی ہے۔

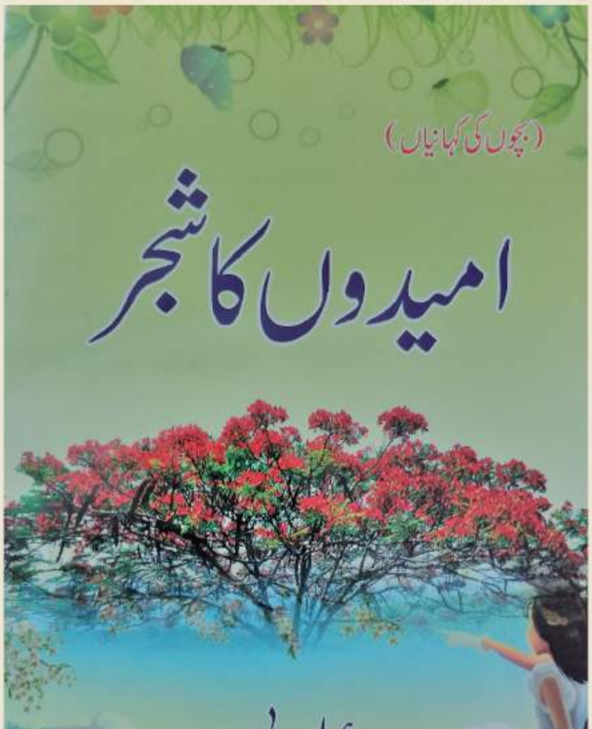

بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے چونکہ عطیہ بی یونیٹی پی جی کالج (لکھنؤ) میں درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ ہیں اور ان کا زیادہ وقت بچوں کی تعلیم وتربیت پر صرف ہوتا ہے۔ یہ بچے اس عمر کے تو نہیں ہوتے جن کے لیے عطیہ بی نے کہانیاں لکھی ہیں لیکن ان بچوں کے ساتھ رہ کر، ان سے گفتگو کرکے، ان کی دلچسپیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرکے عطیہ بی انتہائی خوبصورتی سے ان کی باتوں کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کرلیتی ہیں اور پھر اسی سے وہ کہانی کا تانا بانا بُن کر اسے صفحہ قرطاس پر اُتار دیتی ہیں۔ یہ ان کی بڑی خوبی ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک اہم افسانہ نگار محترم منظور پروانہ نے عطیہ بی کو کہانیوں کے تخلیقی جوہر اور نئے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر کہانی لکھنے پر زور دیا ہے۔ چونکہ عطیہ بی درس وتدریس سے وابستہ ہیں اس لیے ان کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جناب منظور پروانہ نے ان کی اسی ہنرمندی کی داد دی ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ آئندہ اس سے بھی بہتر کہانیاں ان کے قلم سے نکلیں گی جو بچوں کے لیے مزید دلچسپی کا باعث بنیں گی۔

والدین کی پڑھ کر سنائی گئی یا نانی، دادی کی زبانی سنی گئی کہانیاں اور ان کو سننے کا تجربہ ہم بیسوں سال گزر جانے پر بھی نہیں بھولتے۔ کسی بھی صحت مند معاشرے میں بچوں اور کتابوں میں ایک قدرتی ربط ہوتا ہے۔ بچوں کا ادب، جو کسی بھی ادب کا اہم ترین سرمایہ ہوتا ہے، اس ربط کے ذریعہ بچوں تک باآسانی اور مسلسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ کہانیوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے، یہ دنیا بچوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ ان کے اندر نئی نئی کہانیاں پڑھنے یا انھیں سننے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس کے ذریعہ زبان اور اس کی خوبصورتی سے غیر محسوس طور پر متعارف اور ادبی ذوق سے آشنا ہوتے ہیں۔ محترمہ عطیہ بی ہم سب کی جانب سے مبارکباد کی مستحق ہیں کہ وہ بچوں کے لیے انتہائی آسان زبان میں کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ اخلاقی پیغام موجود ہوتا ہے۔ فی زمانہ یہ بڑی چیز ہے اور اس کی ضرورت بھی زیادہ ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کے ذریعہ بچوں کی ذہن سازی اور ان کی علمی تربیت کا کام بخوبی انجام دے رہی ہیں۔

عطیہ بی نے بچوں کے لیے بہت سی سبق آموز کہانیاں لکھی ہیں۔ ان میں سے دو کہانیاں اس وقت میرے پیش نظر ہیں ایک ''دعا گو آنسو'' اور دوسری ''روٹی کی کہانی''۔

دعا گو آنسو میں فرحان کا کردار ہے جس کی ملاقات ایک ضعیف عورت سے ہوتی ہے لیکن اس عورت کا بیٹا اسے ماں نہیں بلکہ ملازمہ سمجھتا ہے اور اسے گھر سے نکال دیتا ہے تو فرحان نہ صرف یہ کہ اسے اپنی ماں کا درجہ دیتا ہے بلکہ اپنے گھر بھی لے آتا ہے۔ یہ سبق آموز کہانی نوجوان بچوں کے لیے بھی ہے جو اپنے والدین کو اولڈ ایج ہوم کی راہ دکھاتے ہیں۔ اس کا اقتباس مدنظر ہے کہ ایک ماں کس طرح لہو کے آنسوؤں کے ساتھ بھی اپنے بیٹے کے لیے دعا گو ہے:

''چلی جاؤ میرا دماغ نہ خراب کرو'' کہتے ہوئے اس نے گھر کے دروازے بند کرلیے۔

ماں کے کلیجے پر پہاڑ سا گر پڑا۔ اور وہ بے بس روتی چلاتی ہوئی رہ گئی۔

فرحان نے مضبوط ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے ہمراہ لے کر اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔نڈھال جسم جیسے اس میں جان ہی نہ ہو صرف اپنے جسم کا بوجھ اٹھائے ایک زندہ لاش کی مانند وہ فرحان کے ہمراہ ہولیا اور فرحان اس کا سہارا بن گیا،مگر واہ ری ماں اس حالت میں آنکھوں میں اشکوں کا سمندر چھپائے، سینے میں ناسور لیے، پھر بھی اپنی اولاد کو دعائیں دیتی ہوئی وہ فرحان کے ساتھ چل پڑی اور فرحان اس جنت کو لیے گھر واپس آگیا۔"

اس کہانی میں بچوں کے لیے یہ درس ہے کہ ہم دوسروں کا بھی سہارا بن سکتے ہیں۔"روٹی کی کہانی" سیما اور ریشما کو اسکول میں ان کی سہیلی صدف نے سنائی۔اس کہانی کی تکنیک انوکھی ہے کہ روٹی خود اپنی حالت بیان کرتی ہے کہ وہ کس طرح دانے سے کھیتوں میں پہنچی اور بالیوں میں تبدیل ہوئی، پھر آٹے کا روپ اختیار کر کے روٹی تک کا سفر طے کیا۔اس سفر میں اسے کتنی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔حد تو یہ ہے کہ اسے توے پر جلنا پڑا تب جا کر وہ کسی کی بھوک مٹانے کے کام آئی۔کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب تک انسان لوہے کی بھٹی میں تپتا نہیں تب تک وہ کندن نہیں بنتا اور جب سونا تپ کر کندن بنتا ہے تب وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے یعنی ہمیں بھی صبر و ضبط سے کام لینا چاہیے اور دوسروں کے کام آنا چاہیے نیز اپنا کام پوری ایمانداری، محنت اور لگن سے کرنا چاہیے۔اس کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"چکی والے نے مشین میں ڈال کر ایسا پیسا کہ جان نکل گئی۔اس مشین سے نکلتے ہی ہماری شکل کچھ اور تھی۔ہماری شکل سفید پاؤڈر کی طرح ہوگئی تھی۔پھر چکی والے نے بورے میں بھر کر ہم کو تمھارے گھر بھیجوا دیا۔سوچا اب سارے امتحان ختم ہو چکے مگر تکلیفوں سے پھر بھی نجات نہ ملی۔صبح تمھاری ماں نے ہم کو روٹی پکانے کے لیے بوری سے نکالا اور پانی ڈال کر اتنا گوندھا اور اتنے گھونسے مارے کہ حالت بگڑ گئی۔پھر گول گول لوئی بنا کر پٹرے اور بیلن سے گول گول روٹی بنائی اور کالے کالے توے پر جو کہ آگ کے اوپر رکھا تھا،اس پر مجھ کو ڈال دیا،بس آگے مت پوچھو! میں تم کو بتا نہیں سکتی کہ ہم پر کیا گزری۔ایک طرف سینکنے کے بعد دوسری طرف سینکا گیا۔ میرے جسم پر کالی کالی چتی پڑ گئی اور میں پھول کر غبارہ بن گئی۔ یہ ہے میری کہانی، کیوں تم کو کیسی لگی میری کہانی؟ مجھ کو کبھی بھی چین نہیں ملا مگر ہاں مجھ کو اس بات کی خوشی ہے کہ میں کسی کے کام آسکتی ہوں۔میری ذات سے کسی کی بھوک مٹ سکتی ہے۔"

محترمہ عطیہ بی کی کہانیوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں سادہ اسلوب اور ندرت و تنوع پایا جاتا ہے۔کہانی کی پیشکش کا انداز بھی ہے اور اس کو دل میں اتارنے کا طریقہ بھی۔

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو ہمارے گھر میں بچوں کا رسالہ 'کھلونا' آیا کرتا تھا۔اس زمانے کے بڑے بڑے ادیب و شاعر بچوں کے لیے ضرور لکھا کرتے تھے۔ ماہنامہ 'کھلونا' کو بڑی مقبولیت حاصل تھی لیکن اردو پر جب زوال کے بادل منڈلانا شروع ہوئے تو 'کھلونا' بھی اس کی زد میں آگیا اور تیز بارش کے ساتھ بہہ کر ہمیشہ کے لیے سمندر میں جا ڈوبا۔اس طرح کے اور بہت سے رسائل بند ہوگئے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان رسائل کے ذریعہ اردو زبان میں بچوں کا بہت سا معیاری ادب تخلیق ہوا۔مولانا اسماعیل میرٹھی کا شروع کیا گیا یہ سلسلہ اب تک کسی نہ کسی شکل میں جاری و ساری ہے۔محترمہ عطیہ بی بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔"امیدوں کا شجر" کے بعد انھوں نے بچوں کے لیے کہانیوں کا ایک اور خوبصورت گلدستہ تیار کیا ہے جس میں اسالیب کی رنگارنگی بھی ہے اور اخلاقیات کا درس بھی۔اس کتاب میں نسل نو کی تربیت کا وافر مواد موجود ہے۔کہانی لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ یہ کام اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب یہ کہانیاں بچوں کے لیے لکھی جائیں۔عطیہ بی صاحبہ نے جو کہانیاں لکھی ہیں ان کی زبان نہایت سادہ اور آسان ہے۔انھوں نے ان کہانیوں کو بچوں کی دلچسپی کی کسوٹی پر زیادہ پرکھا ہے نہ کہ کہانی کے فن کی کسوٹی پر۔

مجھے یقین ہے کہ ان کہانیوں کو بچے پوری دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے اور پسند کریں گے۔اردو کے وہ ادارے جو بچوں کے لیے بہترین ادب سامنے لانے کی کوشش کر رہے ہیں ان کے لیے یہ گلدستہ سودمند ثابت ہوگا۔

□□□

Mohd. Ovais Sambhli
178/157, Barood Kahan
Near Lal Masjid, Golaganj
Lucknow- 226 018 (U.P.)
Mobile: 9794593055
Email:ovais.sambhli@gmail.com

افسانہ

ڈاکٹر شبنم رضوی

خرّاٹے

شادی سے میری نیند اڑ گئی کیونکہ میرے شوہر اس قدر خطرناک خراٹے لیتے تھے کہ میری نیند نے اپنے گھر کو ہی ترک کر دیا۔ میں تنہا ان کے ساتھ کمرے میں گھبرانے لگی۔ مجھے وہ بس دن میں اچھے لگتے رات ہوتے ہی میرا دل گھبرانے لگتا...... اکثر تو ان کے سونے کے بعد میں اٹھ جاتی اور اپنی ساس کے ساتھ سو جاتی۔ پھر وہ ہزار چاہتے کہ میں کمرے میں آجاؤں...... میں ان کے ہاتھ نہ لگتی...... ہماری ساس بڑی ہی مزیدار خاتون تھیں۔ باتیں تو اس قدر عمدہ کرتیں کہ گھنٹوں گزر جائے پتہ بھی نہ چلے...... خاندان کے ہر شخص کی مکمل معلومات ان کے پاس ہوتی۔ وہ ایک ایک رشتہ داروں کے بارے میں باتیں کرتی رہتیں۔ کھانوں اور ان کے ذائقے ان کا بگھار، اس کی مہک، اس سے فائدے گویا ایک بات جو وہ بیان کرتیں مکمل...... وہ ایک تجربہ کار عورت تھیں اور خوب سمجھتی تھیں کہ میں ان کے کمرے میں ان کے لحاف میں آ کر کیوں لیٹ جاتی ہوں مگر انھوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا......

اکثر رات میں وہ ہمیں ڈھونڈتے ہوئے امّی کے کمرے میں آتے اور ہماری چپل دیکھ کر چلے جاتے...... میں سانس روکے لیٹی رہتی...... کیونکہ مجھے وہ جس قدر عزیز تھے ان کے خراٹے اسی قدر غیر عزیز...... ان کے خراٹوں سے میری جان عاجز تھی۔

اسی لگا چھپی میں کب پچیس برس گزر گئے پتہ ہی نہیں چلا۔

آج بہت زمانے بعد رضوان کو دہلی کسی کام سے جانا پڑا۔ وہ رات نو بجے کی ٹرین سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے اور میں نے راحت کی سانس لی...... کہ آج ایک طویل عرصہ بعد میں بغیر خراٹے کے اپنے شاندار کمرے میں سوؤں گی...... جی بھر کے...... خوب دیر تک...... واہ...... واہ...... آج کی رات میری رات ہو گی۔ جہاں خراٹے کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ میں باتھ روم میں گئی شاور کھول کے نہانے لگی۔ اور بعد میں اپنے کنگ سائز بیڈ پر آ کر لیٹ گئی......

مگر آج رات نیند نہیں آرہی تھی۔ کئی مرتبہ الٹی گنتی گن لیا۔ سورہ پڑھی، صدقہ نکالا، ناول کے کئی اوراق پڑھ ڈالے دو تین مرتبہ بیت الخلا ہو آئی۔ اٹھی تو کپڑوں والی الماری درست کرنے لگی۔ لوٹی تو خبروں کا پلندہ رکھا تھا۔ اٹھا لائی اور نئی پرانی خبریں، مضامین وغیرہ کو پڑھنے لگی۔ میں اکتا گئی۔ یا اللہ یہ رات ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ کس قدر لمبی ہے......

”لمبی ہے غم کی رات مگر رات ہی تو ہے“، فیض احمد فیض کے پاس دو دو غم تھے۔ ایک ملک کی آزادی کا، دوسرا محبوبہ کا، مگر ظالم یہاں کون سا غم ہے؟ یہی نہیں پتہ چل رہا ہے۔ میں تھک کے لیٹ گئی اور چھت کی طرف اوپر نظر گئی۔ یا اللہ ابھی تو پنکھا صاف کیا تھا۔ پھر گندا ہو گیا۔ کالا کالا پنکھے کے چاروں طرف گندگی کی بیل لگ گئی تھی۔ وہاں سے نظر ہٹی تو کمرے کی دیواروں پر جالا نظر آ گیا۔ میں نے سوچا ایک طرف تو مکڑی کے جالے کو

منحوس مانا جاتا ہے۔ دوسری طرف مکڑی نے میرے رسولؐ کی جان بچائی تھی۔ مجھے یاد آیا مکڑی پر ایک سورۂ عنکبوت نازل ہوئی تھی۔قرآن شریف میں اس کا ذکر ہے جس کا ترجمہ نہایت عمدہ۔ میں نے فون میں سورۂ العنکبوت کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔

سورۂ العنکبوت میں لکھا تھا:

اس مکڑی کی سی ہے جس نے اپنے خیال ناقص میں ایک گھر بنایا اور اس میں شک ہی نہیں کہ تمام گھروں میں بودا گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔لفظ بودا پر میں اٹک گئی۔موبائل میں ڈکشنری کھولی تو بودا کے کئی معنی نظر آئے۔ بزدل، کم ہمت، ڈرپوک، لاغر، کمزور، دُبلا، ناتواں، پھُس پھُسا، بے مزہ، گلا ہوا، فرسودہ پرانا، یا اللہ کس قدر مطلب ہے ایک لفظ کے۔ اُکتا کر فون رکھ دیا۔

میرا ذہن تھک سا گیا۔میری نظریں جھپکی گئیں، آنکھیں بوجھل ہونے لگیں، جسم تھک گیا۔ میں خوش تھی کہ اب تو نیند ضرور آجائے گی اور میں چین سے سو جاؤں گی۔ میں نے اپنے دماغ کو تمام طرح کی فکروں سے آزاد کیا......اور بوجھل پلکوں کو لبیک کہا...... یہ سوچ کر میں بہت خوشی محسوس کر رہی تھی کہ اب چین کی نیند آئے گی اور میں نے فاتحانہ انداز میں تکیہ پر آہستہ سے سر رکھ کے مخملی چادر میں منہ ڈال دیا۔ پھر یاد آیا......تھوڑا اے سی تیز کردوں......

اُٹھی...... چوبیس، تیس، تیئیس، بائس، اکیس، بیس، توبہ کس قدر گرم چلاتے ہیں اے سی تبھی تو کمرہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ آج کی رات میں اٹھارہ پر چلا کر سوؤں گی۔ میں نے اٹھارہ پر لا کر روک دیا ریموٹ۔

کمرہ اچانک سے ٹھنڈا ہونے لگا۔ میں نے اے سی والی رضائی کھولی کہ بس اب سوؤں مگر یہ دیکھ کر چونک گئی کہ ایک گلاب کا پھول رکھا ہے۔ میں حیرت زدہ تھی کہ پھول کیسے اس میں آیا اور وہ بھی تروتازہ......مگر وہ پھول پلاسٹک کا تھا اور کسی کمپنی کا نام درج تھا۔ میں نے اس کی خوبصورتی کی دل ہی دل میں تعریف کی......اور آنکھ بند کر کے لیٹ گئی......مگر کچھ کمی لگ رہی ہے۔ سو نہیں پائی۔ میرے دل نے کہا......آجائے گی نیند۔ ارے یار پرانے گانے سنتی ہوں......واہ کتنا زمانہ گزر گیا محمد رفیع، لتا کے گانے سنے ہوئے۔ کلاسیکل گانا بجنے لگا۔ میں جھوم اٹھی...... واہ واہ......کیا بات ہے۔ایک سے بڑھ کے ایک گانا آنے لگا۔ کافی دیر تک میں گانا سنتی رہی۔ اب پھر جمائی آنے لگی میرا منہ درد کرنے لگا تھا جمائی لیتے لیتے۔ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ میں نے سوچا......کاش کوئی رومانٹک گانا آئے اور بس وہ سن کے میں سو جاؤں...... ۔ گانا بجنے لگا...... چودھویں کا چاند ہو یا لاجواب ہو...... مجھے فلم یاد آ گئی...... پوری فلم آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ وحیدہ رحمٰن کا انداز، وہ گانا، وہ سین میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ وہ سراپائے حسن، وہ چاندنی رات، وہ بکھری زلفیں، مسکراتے لب، وہ نشیلی آنکھیں، وہ مچلتا جسم، شرمانہ اور پھر شرما جانا......

میں نے سوچا اب تو ضرور نیند آجائے گی۔ بہترین صبح ہوگی، تروتازہ اٹھوں گی...... یہ سوچ کے میں نے چادر میں منہ ڈھک لیا......مگر اب تو نیند سے زیادہ بھوک لگ چکی تھی۔ میں نے بھوک کو ٹالنے کی کوشش کی مگر جناب بھوک تو بچوں تک کی نیند حرام کر دیتی ہے۔ بڑے کس گنتی میں آتے ہیں۔ ہزار چاہا نیند آجائے مگر پیٹ میں چوہا کودنے لگا...... میں اٹھی......کیا کھاؤں؟...... چائے پیوں؟......اپنے آپ سے پوچھا...... نہ بھائی نا......نیند اُڑ جائے گی......میگی بناتی ہوں......آج اکیلے پن کا مزا لیا جائے......

جب میں بستر میں لیٹی تو کافی تھکن محسوس کر رہی تھی...... جمائی پر جمائی آتی جا رہی تھی۔ جمائی لیتے لیتے میرے منہ میں درد ہونے لگا...... بھیا نیند آجائے۔ میں نے نیند کو بہت بلانے کی کوشش کی......نیند تو آنکھوں میں بھری ہے۔ مگر آتی نہیں۔ سو نہیں پا رہی......الٹی گنتی گننے لگی......دعا پڑھ ڈالی...... یا اللہ کیا چیز ہے جس کی کمی محسوس ہو رہی ہے......کچھ کمی کھٹک رہی ہے۔ کیا کمی ہے میرے آس پاس۔ جمائی آتی رہی...... میں منہ پھاڑ پھاڑ کے جمائی لیتی رہی......گانے نے بھی آنا بند کر دیا۔ ریڈیو بند کر دیا۔ سوچا موبائل میں گانا لگالے۔ ساون پر گانے اچھے اچھے آتے ہیں۔ پر اب دل نہیں چاہ رہا تھا جاگنے کا نہ گانا سننے کا...... میں تڑپ گئی...... یا اللہ نیند کیوں نہیں آرہی......

آنکھیں بوجھل ہیں۔ جمائی آئی جاتی ہے، پیٹ بھرا ہے۔ عمدہ بستر ہے۔ نرم تکیہ ہے مخملی چادر ہے۔ موسم سہانا ہے۔ خاموشی ہے، سناٹا ہے...... مگر کچھ کمی ہے؟؟

بے خیالی میں میرا ہاتھ بستر کی دوسری طرف چلا گیا۔ آئے...... رضوان کہاں گئے؟؟ اوہ......وہ تو دہلی گئے ہیں۔ دل ہی دل میں سوچا......

میں اپنے آپ مسکرا دی...... آج بغل میں خراٹا لینے والا جو نہیں ہے...... مجھے سمجھ آیا کہ ان کے خراٹے کی میں کس قدر عادی ہو چکی ہوں......کہ جو خراٹا میری نیند اڑا چکا تھا آج اس کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ خراٹے کے بغیر نیند ہی نہیں آرہی ہے۔

❏❏❏

Dr. Shabnam Rizvi

Head Dept. of Urdu

Karamat Husain Muslim Girls PG College

Nishat Ganj, Lucknow-226001 (U.P)

ترنم جمال

دل کی آنکھیں

دانیہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ لیکن اس کے لاڈ گھر میں سارے لوگ ایسے اٹھاتے جیسے وہ سب سے لاڈلی اور چھوٹی ہو۔

دراصل بات یہ تھی کہ انور حسن اور مدحت حسن کے شادی کے تین سال بعد دانیہ پیدا ہوئی۔ اس عرصے میں ان لوگوں نے شہر کے ہر ڈاکٹر حکیم سے رابطہ کیا۔ سبھی نے امیدیں بندھائیں کہ مایوس نہ ہوں۔ بس خدا کی طرف سے دیر ہے اور پھر اللہ نے ان کی دعائیں قبول کی۔ دانیہ کی صورت میں انھیں پہلی اولاد ہوئی جسے پا کر ان دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ وہ تھی بھی بہت پیاری۔ پھولے ہوئے گال ہنستی تو دونوں طرف ڈمپل پڑ جاتے۔ دانیہ جب پانچ سال کی ہوئی تو مدحت حسن پھر امید سے ہوئیں اور شفا پیدا ہوئی۔ اس کے بعد شفق اور طلحہ بھی آئے۔ لیکن گھر میں جو اہمیت دانیہ کو حاصل تھی بڑے ہو کر سبھی بھائی بہن اس سے واقف ہو گئے۔ لیکن والدین کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ کسی کو بھی اس سے جیلیسی نہیں تھی۔ بھائی بہن بھی ہر کام میں اسے اہمیت دیتے۔

لیکن اتنا پیار، اتنی اہمیت پا کر دانیہ بہت ضدی اور بہت ہٹ دھرم ہو گئی تھی۔ اپنی مرضی تھوپنا اس کی عادت بن گئی۔ حد یہ تھی کہ ماموں خالائیں بھی تحائف لاتے تو سب سے پہلے دانیہ ہی سے پسند کرواتے۔ دانیہ کب اتنی خودسر ہو گئی اس کا علم انوار حسن اور مدحت حسن کو تب ہوا جب اس نے گریجویشن کی تعلیم مکمل کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

خاندان سے کئی اچھے رشتے اس کے لیے آئے۔ لیکن اس نے کسی کو بھی خاطر میں لائے بغیر سبھی کو ریجیکٹ کر دیا۔ ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ کافی گستاخ ہوتی جا رہی ہے اور اسے روک ٹوک چبھنے لگی ہے۔

ایک روز انوار حسن کی بہن رافعہ کا فون آیا کہ وہ اپنے بیٹے راحیل

کے ساتھ آ رہی ہیں۔ گھر میں سبھی کی مصروفیت بڑھ گئی۔ شفا شفق اور طلحہ کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں۔ انھیں اپنے راحیل بھائی کا بے صبری سے انتظار تھا۔ چاروں کی خوب جمتی تھی لیکن دانیہ کو ان سب سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

شام میں وہ یونیورسٹی سے آئی تو سارے لوگ لان میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس نے بھی آ کر پھوپھی کو سلام کیا۔ پھوپھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیٹھا لیا۔ کاہی گرین سوٹ پر چنری کا گرین اور گولڈن امتزاج کا دوپٹہ اوڑھے کانوں میں بڑے بڑے بندے لٹکائے کافی دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ راحیل کی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی ہیں۔

پھوپھی کو آئے ہوئے ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس پر ایک نیا انکشاف ہوا، پھوپھی نے اسے راحیل کے لیے مانگا ہے اور امی ابو بھی تیار ہو گئے ہیں یہ جان کر تو اس نے ہنگامہ کر دیا۔ شفا اور شفق جب اس کے کمرے میں آئے تو اس نے ان دونوں کو بھی ڈانٹ کر بھگا دیا۔

امی جب اس سے اس کا عندیہ معلوم کرنے آئیں تو وہ ان سے الجھ پڑی۔ ''امی یہ سب کیا ہے، ابو سے جا کر کہہ دیں مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔ وہ انھیں منع کر دیں۔ آخر آپ لوگ میرے حال پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے۔'' وہ اونچی آواز میں کافی بدتمیزی سے کہہ رہی تھی۔

''پوری پچیس برس کی ہو گئی ہو تم اس سال۔ تم سے چھوٹی لڑکیوں کی شادی ہو گئی ہے، خاندان میں۔ یہ ہر لحاظ سے بہترین رشتہ ہے۔ ایک بات یاد رکھنا وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ بات کرنے کی تمیز بھلا بیٹھی ہو، یہ کس لہجے میں مخاطب ہو تم مجھ سے۔'' امی غصہ سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اور وہ اوندھے منہ بستر پر گر کر رونے لگی اور ایان کے بارے میں سوچنے لگی۔ ابھی کچھ ہی مہینوں پہلے تو دوستی ہوئی تھی اس سے یونیورسٹی میں۔ کتنا جان چھڑکتا ہے وہ مجھ پر۔ یونیورسٹی میں ساری لڑکیاں اس کی پرسنالٹی سے مرعوب ہیں۔ لیکن اس کی نگاہ التفات مجھ پر پڑی۔ وہ کہتا تھا۔ ''دانیہ تم اور لڑکیوں سے بالکل مختلف ہو، تمھارے بولڈ انداز کا تو میں دیوانہ ہوں۔ یہاں ذرا کسی سے مسکرا کر بات کر لو۔ ایسے شرماتی ہیں، جیسے میں نے انھیں پرپوز کیا ہے، یار بہت ہنسی آتی ہے ان کی بیوقوفی پر۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنستا۔

دوسرے دن وہ تیار ہو کر یونیورسٹی کے لیے نکلنے لگی تو امی نے ناشتے کے لیے اسے آواز بھی لگائی۔ لیکن ''بھوک نہیں ہے'' کہہ کر وہ گھر سے نکل گئی۔ باہر نکلتے ہی دانیہ نے ایان کو کال کیا۔ ''ایان تم کہاں ہو۔ مجھے تم سے ابھی ملنا ہے۔'' اس نے جواب میں کہا۔ ''دانیہ میں یہاں ہوں گھر میں یہیں آ جاؤ۔''

اور وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے رکشا پر بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔

لان عبور کر کے جیسے ہی دروازہ کھٹکھٹانا چاہا وہ اپنے آپ کھل گیا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھیں ساکت رہ گئیں۔ ایان اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ یونیورسٹی کے دولڑکے زوہیب اور واسع بیٹھے جام نوشی کر رہے تھے۔ ان دونوں کے یونیورسٹی میں ریکارڈ اچھے نہیں تھے۔ وہ لڑکیوں سے فلرٹ کے معاملے میں مشہور تھے۔ اچانک ایان کی نظر اس پر پڑی اور اس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آیئے آیئے جان من، اب آ ہی گئیں ہیں تو اندر بھی آ جایئے۔ آپ نے تو بہت ہی ترسایا ہے۔''

وہ اس کے لہجے کے بازاری پن پر چکرا گئی۔ ایان اس کی طرف ہنستا مسکراتا بڑھ رہا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس وقت اسے فکر تھی تو صرف اپنی عزت بچانے کی۔ ایان جیسے ہی اس کے قریب آیا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا وہ پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی، بھاگتے ہوئے اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز بھی سنائی دی۔

گھر آ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے سبھی لوگوں کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

پہلی بار وہ بہت روئی۔ شام ہو گئی لیکن اس نے کمرے کے باہر قدم نہیں نکالا نہ ہی کسی نے اسے بلایا۔ مغرب کی اذان سن کر وہ اٹھی۔ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ نماز پڑھ کر دعائیں کرنے لگی کہ اللہ نے اسے ذلیل ہونے سے بال بال بچایا تھا۔

تب ہی دروازہ کھول کر امی اندر آ گئیں۔ ماں کو قریب دیکھ کر وہ ان کے قدموں سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ پھر اس کے منہ سے جو الفاظ ادا ہوئے ماں کے بے چین دل کو قرار آ گیا۔

''امی میں نافرمان ہو گئی تھی۔ میرے لیے آپ اور ابو بہتر سوچتے ہیں۔ آپ کا فیصلہ میرے لیے اہم ہے۔

ماں نے شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا۔ ان کی آنکھوں میں نئی چمک تھی۔

□□□

Tarannum Jamal
26, Zakaria Street, 4th Floor
Landmark Shri Jabreshwar Mandi
Kolkata-700073 (W.B)

ڈاکٹر وفا یزدان منش

خاموشی کا بوجھ

میں اپنی اندھیری دنیا میں کھوئی ہوئی ہوں جہاں سوالوں کی بھیڑ نے مجھے گھیر رکھا ہے اور ان میں سے ایک سوال ہر وقت میرے سر پر سوار ہے؛ ''خاموش کیوں ہو!! کچھ تو بولو!!!'' اس کا جواب میری تیز دھڑکنوں کے سوا کچھ نہیں۔ ان لمحات میں گویا میرے جسم سے دھواں نکلنا شروع ہوا ہے اور سخت سردی میں بھی مجھے پسینہ آ رہا ہے۔ آنسو آنکھ کے پیچھے جیسے تیار کھڑے ہیں اور گلے میں سسکیاں دبی ہیں جو پھوٹنے کی منتظر ہیں۔ کچھ دیر پہلے میں ان دونوں کو چھوڑ کر واپس چلی آئی؛ مگر دماغ پر بوجھ اتنا بڑھ گیا ہے کہ قدم جیسے کسی بھاری ڈھیر کو گھسیٹتے گھسیٹتے آگے لے جا رہے ہیں۔ ابھی چند قدم پیچھے، صفورہ کی چیخیں میری روح و جان کو خراشیں دے رہی تھیں، مگر اب میری چبھن کی خاموش فریاد کسی اور آواز کو مجھ تک پہنچنے نہیں دے رہی۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی میں کیوں چپ رہی؟؟ یہ کون سی بڑی طاقت ہے جس نے مجھے چپ کیے رکھا!؟؟ یہ طاقت میرے اندر سے اٹھی ہے یا آسمان سے اتر کر میرے وجود پر طاری ہوئی ہے! یہ کہیں میری کمزوری نہ ہو جس کی وجہ سے میں گونگی ہو گئی ہوں! اس کا جھوٹ اور الزام سن کر کیوں کر کھسیانی ہو کر اپنی عزت و حیثیت گھٹنے دے رہی ہوں!!

کاش ہوش میں آؤں اور آج کا بھیانک منظر خواب پاؤں۔۔۔ اس سے بڑھ کر گزشتہ دو سال سے جو میری زندگی میں لہریں امنڈتی رہی ہیں سبھی کو خواب پاؤں! کاش کبھی اس کے بناوٹی وقار کا دھوکا نہ کھاتی۔ کاش اس کو پہچاننے کے بعد بھولی بن کر اپنا دل نہ بہلاتی۔ اب ''کاش'' کی گنجائش نہیں ہے، سلجھانے کے لیے بھی کوئی بات اور وجہ نہیں رہتی سوائے پچھتاوے کے، سوائے الزام کا بوجھ عمر بھر اٹھانے کے لیے۔۔۔۔۔

''ہماری دوستی ٹھیک نہیں ہے، آپ شادی شدہ ہیں، آپ کی بیگم کو پتا لگے تو!''۔۔ ہر دفعہ یہی بات دہراتی رہی مگر وہ ڈٹا رہا۔ عجیب سی کیفیت تھی کہ اس کی خواہش کا وفور میرے دل کو بھاتا تھا کہ ایسا سنجیدہ اور مشہور آدمی مجھ سے دل لگا بیٹھا ہے۔ زبان سے انکار کرتی اور مگر تن من دھن سے اس کے پیار پر قربان ہو چکی تھی۔ پھر بھی ایک خوف مجھے اس سے باز رکھتا اور میں اس خوف پر قابو پانے کے لیے لڑتی رہی۔ ''ایسے رابطے چھپے نہیں رہتے، کہیں صفورہ کو محسوس ہو جائے تو کیا ہوگا! اس انجام کے بارے میں آپ نے کبھی سوچا! آپ کی زندگی میں گڑبڑ پیدا ہو جائے تو میں بھی اس کی آگ میں لپٹنے سے نہیں بچوں گی!'' اس طرح کی باتیں میں مختلف طریقوں سے اسے بتاتی رہی مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور ہر صورت میں مجھ کو منائے رکھنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتا رہا اور اس طرح اپنی باتوں کا زہر مجھے پلاتا رہا: ''صفورہ کو پتا چلے تو ظاہر ہے اس کو جلن ہوگی، مگر آپ کو کھونا بھی میرے لیے موت کے برابر ہے، آپ بے فکر رہیں، ہم اس کو

محسوس ہونے نہیں دیں گے اور کہیں بھی وہ پوچھے تو میں بتادوں گا کہ افرا کا میں نے خود پیچھا کیا۔۔کئی سالوں سے آپ میرا خواب بن گئی ہیں اور اتنے برسوں کے بعد میں نے اپنی پوری طاقت سمیٹ کر آپ سے اظہار عشق کیا ہے۔آپ تو میری جان ہیں''۔

''جان!!! جان کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔کیا ادا کر پائیں گے؟''۔میں نے اس کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''جی مجھے معلوم ہے ادا کروں گا پوری پوری، آپ دیکھیں گی''۔۔۔

میں نے اس کو سمجھایا:''میرے نزدیک عزت اور توجہ سے زیادہ کوئی قیمت نہیں۔کیا ادا کریں گے؟۔۔۔۔''

''آپ کی عزت مجھے اپنی عزت اور اپنے آپ سے زیادہ عزیز ہے۔میں دل پھینک نہیں ہوں افرا''۔اس کی بات، وعدہ سمجھتے ہوئے میں نے بھروسہ کر کے اس کے سامنے سر جھکا دیا۔

توصیف اور میں اپنی محبت میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے، یوں لگتا تھا کہ میری زندگی کی ساری محرومیاں اور کمیاں آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہیں، دن میں گھنٹوں تک باتیں کرتے رہنے کے بعد بھی ہمارا دل نہیں بھرتا تھا۔لیکن چند مہینوں کے بعد مجھے شک نے گھیر لیا، دل برداشتہ ہونے کے باوجود بھی اس شک سے بھاگنا چاہتی تھی۔توصیف اب صحیح سے میرا جواب نہیں دے رہا تھا، میرا فون نہیں سن رہا تھا، ملنے سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا تھا!! آخر بے بس ہو کر میں نے اس سے بے رخی کا شکوہ کیا تب اس نے اشارتاً کہا :''ایک دفعہ آپ کا فون آرہا تھا تو صفورہ نے دیکھ لیا۔کچھ کہا تو نہیں مگر اس کا منہ آج کل لٹکا ہوا ہے اور دوسری دفعہ جب آپ کا میسج آیا، اس کی نظریں فون کی اسکرین پر پڑیں۔شکر ہے آپ نے کوئی ایسے خطرناک الفاظ نہیں لکھے تھے۔بس اسی وجہ سے احتیاطاً میں آپ سے دور ہوں ۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔۔۔'' توصیف مجھے منائے جا رہا تھا اور میں صفورہ کے لیے فکر مند ہونے کی بجائے اس بات سے پریشان ہوئی کہ کہیں میرے اور توصیف کے درمیان کوئی دراڑ پیدا نہ ہو!

اس کے بعد سے میں خود سے توصیف کو بہت کم میسج کیا کرتی اگر وہ خود بات شروع کرتا تب میں بات شروع کرتی، اس کا فون آتا تب فون پر بات ہوا کرتی۔دھیرے دھیرے میں سمجھنے لگی کہ بات صرف یہی نہیں، توصیف جب اپنے آفس میں ہوتا ہے یا جب اکیلا دوسرے شہر چلا جاتا ہے تب بھی مجھ سے رابطہ کم ہی کرتا ہے۔میرا دل اس کے حق میں گواہی نہیں دیتا تھا اور مجھ سے الٹی سیدھی بات برداشت بھی نہیں ہوتی۔پھر بھی اپنے آپ کو جھٹلا دیا کرتی تھی۔سب سے زیادہ افسوس اس وقت ہوتا ہے جب ہم دھوکا کھانے کے باوجود منہ پھیر کر باز نہیں آتے۔سب سے زیادہ نقصان اس وقت ہوتا ہے جب ہم سپنے میں جو اپنا من پسند کردار بناتے ہیں جس سے محبت کرتے ہیں اس کو، اسی کردار کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے بناوٹی کردار پر خدشہ نہ لگنے کے لیے ہر طرح کی جدوجہد کرتے ہیں۔جہاں جہاں اپنے سپنے کے خلاف بات نظر آئے اس کو جانچنے کی جگہ نظر انداز کرتے ہیں۔میرے ساتھ بھی ایسا ہوا۔توصیف کا جھوٹ، سچ مانتی تھی۔اس کی شرافت پر یقین کرتی اور اس کے خلاف کچھ سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔یہ سلسلہ جاری رہا ہم کم ملتے مگر جب بھی ملتے میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور ایک دوسرے کے لیے یادگار لمحات بنائے جاتے تھے، نم آنکھوں سے ایک دوسرے سے الگ ہوتے تھے، یادوں کا سہارا لے کر جیتے تھے۔

ایک بات کی ہمارے بیچ میں الجھن ہوا کرتی تھی؛ توصیف کو صفورہ کا خوف گھیرے رہتا تھا اور اس کا یہ احساس مجھے گوارا نہیں تھا، اس کی وجہ زنانہ جلن نہیں تھی۔میں نے کبھی صفورہ کو اپنی رقیب نہیں جانا اور کبھی ان دونوں میاں بیوی کا رشتہ بگاڑنے کی کوشش نہیں کی۔مگر توصیف کی بے چینی سے بیزار ہوتی تھی۔اس کو اپنے افسانوی کردار کی طرح بہادر اور مضبوط دیکھنا چاہتی اور اس کا یہ ڈر میرے ہیرو کو زیب نہیں دیتا تھا۔توصیف کا ایک اور بھی اندیشہ تھا جو ہمارے تعلقات پر کافی اثر انداز ہوتا تھا۔کئی عورتیں جو بظاہر صفورہ کی پکی دوست تھیں مگر توصیف پر نظر رکھتی تھیں اور ان کو ہمارے بیچ محبت کا پتا چل گیا تھا۔وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات بنا کر ہماری ٹوہ لیا کرتی تھیں اور صفورہ کو ہوشیار کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔یہ وہ عورتیں تھیں جن کے ساتھ توصیف کا چکر تھا اور وہ عورتیں حسد کے مارے جلتی ہوئی اپنی آگ بجھانے کے لیے صفورہ کے ذریعے بدلہ لینے کی کوشش کرتی تھیں۔پھر بھی مجھے توصیف پر

''اس کے بعد سے میں خود سے توصیف کو بہت کم میسج کیا کرتی اگر وہ خود بات شروع کرتا تب میں بات شروع کرتی، اس کا فون آتا تب فون پر بات ہوا کرتی۔دھیرے دھیرے میں سمجھنے لگی کہ بات صرف یہی نہیں، توصیف جب اپنے آفس میں ہوتا ہے یا جب اکیلا دوسرے شہر چلاجاتا ہے تب بھی مجھ سے رابطہ کم ہی کرتا ہے۔''

برسنے اور اسے جلی کٹی سنانے کی عادت نہیں تھی۔ میری خواہش تھی کہ جہاں تک ہو سکے اس کو خوشیوں سے سرشار کر ڈالوں۔ میں نے کبھی اس کی دوسروں سے دوستی کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا۔ صفورہ سے میری شروع سے سلام و دعا رہا کرتی تھی، جب سے توصیف نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا میں صفورہ سے ملنے میں احتیاط برتتے ہوئے اس سے دور رہنے لگی تھی۔ نہ جانے اس سے شرماتی تھی یا جھجکتی تھی! بس اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا میرے بس میں نہیں تھا۔ حالانکہ توصیف نے ایک دفعہ مجھ سے کہا: ''افرا! آپ صفورہ کے ساتھ دوستی مزید مضبوط کریں، اس کے قریب جائیں، یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہے''۔ میں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا: ''میں صفورہ کو کبھی ہتھیار نہیں بناؤں گی، میں آپ کی فیملی کے ساتھ کبھی ایسا کھیل نہیں کھیل سکتی''۔

"توصیف کو فون بھی نہیں کرسکتی تھی کہ کہیں وہ گھر سے نکلا ہی نہ ہو تو! مدتوں بعد آج ہمیں ملنا تھا! میں تڑپ رہی تھی! میں اس کے ساتھ کا، اس کے قرب کا ایک لمحہ بھی گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ ہر سیکنڈ میرے لیے قابل قدر ہے، ہر پل کو یاد بنا کر دل میں بسانا چاہتی ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے لمحے یادوں کی موت ہوں گے"

آج! آج! صبح اٹھتے ہی نحوست چھائی ہوئی تھی؛ کسی کی بددعا لگ گئی ہو، جیسے۔ توصیف سے ملاقات ہونے کی بات چند دن پہلے سے طے تھی۔ اس کے پسندیدہ سرخ رنگ کے کپڑے خرید کر رکھے تھے، پہنتے وقت شرٹ کی کے بٹن ٹوٹ گئے، میرے آنسوؤں کی لڑی بن گئی۔ دوسرے کپڑے پہنے، نیلا رنگ بھی اس کو اچھا لگتا تھا، پورا سیٹ بدلنا پڑا۔ نیلے اور گلابی رنگوں کی میچنگ بنائی۔ مگر اچانک فیصلہ بدلا، سر سے پاؤں تک کالے رنگ کے کپڑے پہنے۔ اپنی گاڑی چلانے بیٹھ گئی، اے خدا، یہ بھی میرے ساتھ ضد کر رہی ہے، اسٹارٹ ہی نہیں ہوتی۔ توصیف کو فون بھی نہیں کرسکتی تھی کہ کہیں وہ گھر سے نکلا ہی نہ ہو تو! مدتوں بعد آج ہمیں ملنا تھا! میں تڑپ رہی تھی! میں اس کے ساتھ کا، اس کے قرب کا ایک لمحہ بھی گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ ہر سیکنڈ میرے لیے قابل قدر ہے، ہر پل کو یاد بنا کر دل میں بسانا چاہتی ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے لمحے یادوں کی موت ہوں گے۔ ٹیکسی بلائی، راستے میں خود کو کئی بار شیشے میں دیکھا، دل میں سوچا، اس دفعہ وہ اور زیادہ میرے حسن کو سراہے گا۔

ملتے ہی ہم بچوں کی طرح کھلکھلا اٹھے، ہم نے ہنسی اور قہقہوں سے بھرے لمحات گزارے۔ توصیف کی آخری بات میرا ہاتھ تھامتے ہوئے یہی تھی: ''افرا آپ میری خوشی ہیں، میری جان ہیں، جان اور خوشی نہ ہو، تو زندگی پھیکی رہ جائے گی، بارش کی جتنی بوندیں ہیں میں آپ سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں۔ وعدہ کریں کہ میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گی، تاعمر ہم دوست رہیں گے''۔

جہاں ہم تھے وہاں ایک بڑے باغ میں چھوٹا سا مکان تھا۔ توصیف کے دوست کا تھا یا رشتے دار کا، میں نے پوچھا نہیں۔ ہم صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے اپنی دنیا میں گم تھے۔ اچانک اس مرحلے کا سامنا کیا جس کا کبھی ہم نے سوچا بھی نہیں تھا! ہم کیا دیکھ رہے تھے! سامنے جو شخص نظر آ رہا ہے، وہ واقعی صفورہ ہے!!! میں نے آنکھیں کئی دفعہ ملیں، توصیف لرزتے ہوئی آواز سے بولا: ''صفورہ، جانو! آپ یہاں!!'' میں دھک سے رہ گئی'' ایک لفظ تک نہیں بولی۔ صفورا چڑی ہوئی آگے آئی تو کہرام مچ گیا۔ میں نے آنکھیں نیچے کیں۔ وہ لال پیلی آنکھیں نکال کر اونچی آواز میں بولے جا رہی تھی'' افرا مجھے سخت دلی افسوس ہوا، تمھارے اور میرے شوہر کے درمیان ایسے تعلقات! تم اس طرح کے کردار کی مالک ہو! میرے شوہر کے ساتھ کی گئی تمھاری گفتگو کے بہت سے اسکرین شاٹ میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں تم پر مقدمہ چلاؤں گی۔ میرے شوہر کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی، تم نے اس کو بگاڑ دیا ہے!!''

میں کیا سن رہی تھی؟؟ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہے! مجھ کو کون سی کسوٹی پر پرکھ رہی ہے! میں غلط عورت نہیں ہوں، مگر کیا ثبوت دوں۔ وہ توصیف سے مخاطب ہو کر چلا رہی تھی: ''تمھیں دکھاؤں گی! کئی دفعہ تمھیں دھمکی دی مگر اس کے باوجود تم اس عورت کو اپنی زندگی سے نکال نہیں سکے! کیا اس کی درخواست کا انکار کرنا تمھارے لیے اتنا مشکل ہے! ابھی اس سے کہو کہ اس کے بعد تم سے نہ ملے گی۔ تمھیں گھر آنے کی تب تک اجازت نہیں ہوگی جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوگا کہ تمھاری زندگی میں اس کا اور میرا کیا مقام ہے!'' ۔۔ میں اور حیران ہوئی کہ صفورہ کیا سمجھ رہی ہے! کہ میں اس کے شوہر کے پیچھے پڑی ہوں! میں شدت سے اس انتظار میں تھی کہ توصیف کچھ کہے اور میری جان اس ماجرے سے چھڑائے۔ جو کچھ زبانی طور پر وعدہ کیا تھا اب عملی طور پر اس کا ثبوت دے، میری عزت

بچالے۔کیا بیہودہ توقع تھی میری۔

توصیف عاجزانہ لہجے سے کہنے لگا: ''صفورہ میں آپ کے سوا کسی سے پیار کیسے کروں! جانو! آپ میرے بچوں کی ماں ہیں! مجھ سے غلطی ہوئی، جی مجھے اندازہ ہے، آپ کو بتایا تھا نا کہ افرا کے کئی دفعہ میسجز آئے اور کام کے حوالے سے اس نے مجھ سے بات کرنے کی درخواست کی تھی، مجھے کیا پتا تھا کہ وہ مجھے پھنسانے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ ایسی ویسی باتیں جو ہمارے بیچ میں ہوئیں تھیں تو وہ ایک کھیل کی طرح ہیں جو مردوں کے ہاں اکثر ہوا کرتی ہیں۔۔کوئی سریس بات نہیں۔۔۔'' ۔میرے منہ میں ایک دم کڑواہٹ پھیل گئی، نسوں میں خون کی گردش رکنے لگی!! ایسا لگتا تھا کوئی مجھ سے میری حیثیت کو چھین رہا ہے۔کیا واقعی توصیف سے ہی یہ الزامات کی بوچھار مجھ پر ہو رہی ہے! صفورہ کی جلی کٹی باتیں توصیف کی باتوں سے ٹکرا رہی تھیں: '' کیوں تم غلط طرف چلے! اگر میں مردوں کے سامنے اس طرح ڈھیلی پڑ جاؤں تو کیا تم برداشت کرو گے! بس۔۔۔بس۔۔۔'' توصیف ایسے بولے جا رہا تھا جیسے یہ سب باتیں اس نے ایسے ہی کسی وقت پر پھٹاپھٹ کہنے کے لیے پہلے سے زبانی یاد کر رکھی ہوں جیسے اس نے پہلے سے تیاری کی ہوئی ہو: ''قسم سے افرا کو میں نے آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ آپ نے اس سے ہر قسم کے رابطے کے لیے منع کیا ہے اور ہمارا ملنا صحیح نہیں ہے، اس نے کہا صرف اس دفعہ ملیں، دیکھیں صفورہ دیکھیں اس کے میسجز دیکھیں، میں نے کہا تھا کہ مجھے آپ سے ملنے کا خوف ہے مگر اس نے ضد پر آ کر کیا لکھا ہے: ''آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔آپ کا سب خوف دور کر دوں گی''۔

ارے، میرے ہوتے ہوئے اس طرح باتیں کر رہا تھا۔ہاں صحیح ہے میں نے لکھا تھا مگر تب اس نے یہ لکھا تھا کہ'' آج دنیا چھوڑ کر آپ کے پاس آ رہا ہوں، آپ سے ملنے کے بعد مجھے ایک پر رونق دنیا ملتی ہے، جب آپ سے ملتا ہوں ملتے ہی جدائی کا خوف سوار ہو جاتا ہے۔'' ابھی وہ میسجز میرے فون میں محفوظ ہیں، مگر دکھانے کی ہمت کہاں! میں ایک لفظ بولوں تو ان دونوں کی زندگی اور بگڑ جائے گی، ان کے بچوں کے سروں سے چھت چھن جائے گی۔

توصیف مجھ پر نگاہ ڈالے بغیر صرف اور صرف اپنی محترمہ بیگم کی طرف متوجہ تھا: ''صفورہ میں جال میں آ گیا پہلے بھی اس جال سے نجات پائی تھی، اب تم دیکھو بالکل اس جال کو پھینک کر ہمیشہ کے لیے اس سے دور رہوں گا۔ اب آپ دیکھیں ہر جگہ افرا کو بلاک کر دیا۔ دیکھیں دیکھیں۔۔۔بس آپ خفا نہ ہوں''۔

ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا میں اس کے بہتانوں اور الزامات کے تلے پسی چلی جاتی تھی۔میری جان و روح کو ناسور چاٹنے لگا تھا۔میں چلنے لگی، کچھ بولے بغیر، اپنے حق کا دفاع کیے بغیر بس چل پڑی۔ ''توصیف سے دور رہو، اب اس سے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی تو میں تمھاری ناک کاٹ دوں گی۔'' صفورہ کا توہین آمیز لہجہ ختم ہونے والا نہیں تھا۔ یوں بھی میں اگر ایک لفظ بھی بولتی تو ان کا گھر اجڑ جاتا مگر مجھے ایسا ہونے نہیں دینا تھا اور نہ آئندہ ایسا ہونے دوں گی۔۔۔جتنا توصیف دغا باز ہے صفورہ اتنی ہی بھولی بھالی عورت ہے۔میں ہمیشہ کے لیے خود جا رہی ہوں مگر صفورہ کو کون بتانے والا ہوگا کہ آپ کے شوہر کا چکر افرا تک محدود نہیں، ان کے سارے میسجز چیک کریں تو ان کے دوسروں سے بھی تعلقات آپ کو نظر آ جائیں گے۔

میں اس کھیل میں ہار گئی معصوم بچی کی طرح باغ کے بیرونی دروازے کی طرف جا رہی تھی کہ توصیف کا سایہ اپنے آگے دیکھا اور اس کی مری مری مدھم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔'' افرا! آپ کا بیگ! ۔۔۔مڑے بغیر بیگ لینے کو صرف ہاتھ تھوڑا پیچھے کی طرف پھیلا دیا۔۔ بیگ چھوتے ہی اپنا دایاں قدم اٹھایا ایسا لگتا تھا کسی نے دس کلو کا باٹ میرے پیر سے باندھ دیا ہو۔میرے کانوں میں پڑنے والی آواز اور بھی مدھم ہو گئی: ''افرا! میری مجبوری ہے، بس یہی راستہ ہے صفورہ کو منانے کے لیے، میرا انتظار کریں، ایک دو مہینے کی بات ہے، برداشت کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا، پلیز،۔۔ میں آپ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔۔۔۔۔''

''میری جان'' بہت سستی بک گئی۔میں دکھ کی ماری، خاموشی کا بوجھ کندھوں پر لادے چل پڑی، بھاری قدموں سے، ٹکڑے ٹکڑے وقار، پارہ پارہ جذبات کی گٹھڑی لادے۔۔ یہ سب بھاری چیزیں کہاں لے جاؤں گی! کہاں تک لے جا سکوں گی! باغ کے دروازے سے نکل رہی ہوں، باہر سامنے جو طویل راستہ ہے اس کو دیکھتی ہوں، اس میں بہت سی مختلف کیفیات دھندلی دھندلی ٹمٹما رہی ہیں، سوائے ''انتظار کے''۔۔۔۔

□□□

Dr. Wafa Yazdan Manesh
Associate Prof.
University of Tehran
44Nateqi, Niro E, Daryei
ST. Resalat
SQ. Tehran(Iran)

غزلیں

شبانہ عشرت

منظر سے کسی روز ہٹالو مری آنکھیں
پھر بیچ سمندر میں اچھالو مری آنکھیں

چہرے سے اسی وقت نکالو مری آنکھیں
پھر شوق سے درپن میں سجالو مری آنکھیں

تکلیف سے اس درد کے گزرو کبھی خود بھی
لو آج سے رستے میں بچھالو مری آنکھیں

ڈرتی ہوں کہ آنکھوں میں کوئی نام نہ پڑھ لے
قابو نہیں آتی ہیں سنبھالو مری آنکھیں

صدیاں ہوئیں میں نے کبھی دیکھا نہیں تم کو
بیکار ہیں پھر خاک میں ڈالو مری آنکھیں

دیکھو مری آنکھوں سے کبھی اپنا بھی چہرہ
پلکوں کے جھروکوں میں بسالو مری آنکھیں

بس دید کی اک آس میں جلتی ہیں یہ عشرت
ہاتھوں سے کسی روز بجھا دو مری آنکھیں

مرا غرور بھی تو، میرا پاسبان بھی تھا
مری حیات بھی تو، میرا اک جہان بھی تھا

ترے حصار سے نکلی تو عمر بھر بھٹکی
پتہ نہیں تھا مگر تو کہ سائبان بھی تھا

یہ کیسی موج بلا ہے کہ کشتیاں زد پر
اگر چہ ہاتھوں میں میرے تو بادبان بھی تھا

وہ ایک شخص مگر کائنات ہو جیسے
مری زمیں ہی نہیں وہ تو آسمان بھی تھا

میں تیری نظروں کا مفہوم ہی سمجھ نہ سکی
حدیث دل کا کہیں اس میں کچھ بیان بھی تھا

خود اپنے آپ کو جانا ترے حوالے سے
تو میری ذات کا حصہ بھی، ترجمان بھی تھا

Shabana Ishrat
C/o. late Abdul Rahman
Milan House, Near Shadi Mahal
Dargah Road, Pathar ki Masjid
Patna-800006 (Bihar)

حسن سخن

ڈاکٹر حنا شمائم

آخری باب

میں منتظر ہوں پر اس کا نہ کوئی جواب آیا
نہ وہ آئی ہے نہ ہی اس کا کوئی خواب آیا
شہر میں ہر طرف ہے حسن یار کا چرچہ
ہر زبان یہ کہتی ہے کیا ٹوٹ کر شباب آیا
رخ روشن تھا زلفوں سے کچھ یوں گھرا ہوا
ابر کی پناہ میں جیسے ہو مہتاب آیا
جل اٹھے کئی دل تپش حسن سے بے ساختہ
گماں ہوا جیسے محفل میں ہو آفتاب آیا
مانا کہ پرواہ نہیں تھی اس کو کچھ میری
دیکھ کر مجھے رخ پہ کیوں رنگ حجاب آیا
اس کی نظروں سے محسوس ہوا تھا مجھ کو
میرے نصیب میں شاید یہ گوہر نایاب آیا
ہوش کھویا بھی نہیں ہے جب میں نے
دیوانگی کا میرے حصے کیوں خطاب آیا
خاک کے دریا میں مل جانا ہے جب ایک دن
کیا فرق اگر سطح پر کوئی بن کر حباب آیا
مستقل مزاجی اس کی فطرت میں تھی نہیں
ایک پل کو اس طرف وہ مانند سیماب آیا
بصد شوق پڑھ رہی تھی میں تو کتاب زندگی
شمائم نظر کے سامنے، بہت جلد آخری باب آیا

Dr. (Mrs.)Hena Shamayem
Alam Clinic
Kaghzi Mohalla
Bihar Sharif
Nalanda-803101 (Bihar)
Mob. No: 9631657626

لذیذ پکوان

لذیذ زردہ

اشیا: چاول ایک کلو گرام، پستہ 100 گرام، الائچی 10 گرام، نارنگی کا چھلکا ایک عدد، کشمش 100 گرام، بادام 125 گرام، زعفران ایک ماشہ، چینی، زرد رنگ حسب ضرورت

بنانے کی ترکیب: نارنگی کے چھلکے پر سے سفید گودا الگ کرلیں اور پیلا سخت چھلکا باریک کاٹ لیں اور پانی میں ابال کر ایک طرف رکھ دیں۔ پانی زردہ رنگ ڈال کر ابلنے کے لیے رکھ دیں۔ چاول بھگوئے ہوئے خشک کر کے ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیں۔ جب گل جائیں تو پانی نکال دیں۔ اب نارنگی کے ٹکڑے، بادام، پستہ، صاف کیا ہوا کاٹ کر ڈال دیں، الائچی بھی شامل کر کے گھی میں پکالیں۔ اب چاول بھی شامل کرلیں۔ 5 منٹ بعد دودھ کا چھینٹا دیں زعفران، کیوڑہ پیس کر شامل کریں اور دم پر رکھ دیں۔

ونیلا آئس کریم

اجزا: ڈبل کریم (دو پیالی)، دودھ دو پیالی، انڈے (چار عدد زردی الگ کرلیں) شکر (تین چوتھائی پیالی) ونیلا ایسنس (حسب ضرورت)

بنانے کی ترکیب: نان اسٹک پین میں دودھ اور کریم ڈال کر درمیانی آنچ پر پکائیں اور لکڑی کے چمچ سے مکس کریں۔ پیالے میں انڈے کی زردی، ونیلا ایسنس اور شکر ڈال کر خوب پھینٹیں اس کے بعد اس میں کریم اور آدھی پیالی دودھ کے آمیزے کو زردی میں ڈال کر بیٹر سے اچھی طرح مکمل کریں۔

اس کے بعد زردی والے آمیزے کو ساس پین میں گرم ہوتے ہوئے آمیزے میں شامل کر کے ہلکی آنچ پر آٹھ منٹ تک پکائیں۔

آمیزہ اتنا گاڑھا ہو جائے کہ چمچے پر اس کی کوٹنگ سی بننے لگے تو ساس پین کو چولہے سے ہٹالیں۔

آمیزے کو چھان کر سانچے میں ڈالیں اور ڈھانپ کر فریزر میں رکھیں۔ اس کے بعد نکال کر بیٹر سے پھینٹ کر دوبارہ چھ سے آٹھ گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔ مزے دار آئس کریم تیار ہے۔

کچی لسی

اجزا: دہی آدھا کلو، دودھ ایک کپ، زیرہ ایک چائے کا چمچ بھنا ہوا، کالی مرچ ایک چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، چینی تھوڑی سی، برف کے چھوٹے ٹکڑے حسب ضرورت، ٹھنڈا پانی آدھا کپ

بنانے کی ترکیب: تمام اجزا بلینڈر میں شامل کر کے بلینڈ کر لیں۔ لسی گلاس میں نکال کر پیش کریں۔

آئس کریم فروٹ سلاد

اجزا: سمر فروٹ مکس (سٹرابری، انگور، رس بھری) 8 کپ، انڈے (زردی سفیدی الگ الگ) 2 عدد، دہی 1 کپ، انگور کا سرخ رس پون کپ، جیلاٹن پاؤڈر 1 کھانے کا چمچ

بنانے کی ترکیب: آدھے پھل بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر لیں اور چھلنی سے چھانیں تا کہ کوئی سخت چیز باقی نہ رہے۔ پھلوں کے آمیزے میں دہی اور انڈے کی زردی ڈال کر خوب پھینٹیں۔ انگور کے رس کو گرم کریں جب ابلنے لگے تو جیلاٹن پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح حل کر لیں۔

جیلاٹن پاؤڈر کے محلول کو آہستہ آہستہ پھلوں کے بلینڈ شدہ آمیزے پر انڈیلیں اور چمچ ہلاتے رہیں پھر کسی پیالے یا سانچے میں ڈال کر فریج میں جمنے کے لیے رکھ دیں۔

انڈے کی سفیدی کو اچھی طرح پھینٹیں اور آدھ جمے ہوئے آمیزے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کر دیں۔

آمیزے کو دوبارہ سے فریزر میں رکھیں اور جمنے دیں جب مکمل طور پر جم جائے تو نکالیں اور بقیہ بچے ہوئے پھلوں کے ساتھ پیش کریں۔

(بحوالہ: میٹھا دسترخوان، آذین غوث، سن اشاعت 2019، مکتبہ امام اعظم، دہلی)

رحم کی رسولی: خواتین کا ایک عام ٹیومر

ڈاکٹر احسان رؤف

Fibroid رحم کا ایک صرف بہت ہی عام سلعہ Benign tumour نہیں ہے ، بلکہ یہ عورتوں کا ایک بہت ہی عام Benign Tumour ہے۔ یہ ٹیومر Smooth muscles اور Fibrous connective tissue سے بنا ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کو Myoma, Uterine Leiomyoma یا Fibromyoma کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ عام طور پر 20 فیصد خواتین میں 30 سال کی عمر میں Fibroid دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ صرف ۳ فیصد مریضوں میں Fibroid کی علامات پائی جاتی ہیں۔ Fibroid عام طور پر Nulliparous (ایسی خواتین جن کی کوئی اولاد نہ ہوں) خواتین میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

محرکاتی عوامل (Predisposing factors)

ایسا دیکھا گیا ہے کہ Fibroid ایسی خواتین میں زیادہ پایا جاتا ہے جن کا وزن طبعی سے زیادہ ہو، Nulliparous ہوں جبکہ ایسی خواتین جو Smoking کرتی ہوں اور Multiparous (ایسی خواتین جن کی زیادہ اولاد ہوں) ان میں Fibroid کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

اقسام (Types)

Fibroid کے رحم میں مقام (Sites) کے اعتبار سے درجہ ذیل قسمیں پائی جاتی ہیں۔

1۔ Body (جسم) اس کو Corporeal بھی کہتے ہیں۔ یہ Fibroid عام طور پر رحم کے جسم میں واقع ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک سے زیادہ ہوتی ہے۔

2۔ Cervical یہ Fibroid بہت کم پائے جاتے ہیں۔ یہ رحم کے Cervix میں پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر ۱ سے ۲ فیصد خواتین اس قسم میں مبتلا ہوتی ہیں۔

علامات (Clinical Features)

زیادہ تر خواتین میں کوئی علامات نہیں پائی جاتی ہیں۔ تقریباً ۷۵ فیصد خواتین میں علامات نہیں ہوتی ہیں۔ Laparotomy, Laparoscopy اور Ultrasonography کرانے پر Fibroids کی تشخیص ہوتی ہے۔ Fibroids کی علامات Fibroids کے مقام (Site) اور Size پر منحصر ہوتی ہیں۔ Fibroids میں مبتلا خواتین میں درج ذیل علامات پائی جاتی ہیں۔

1۔ کثرت طمث (Menorrhagia)

Fibroid میں مبتلا مریضوں میں حیض کے دوران طبعی سے زیادہ خون کا اخراج ہوتا ہے، یہ ایک عام علامت ہے۔

2۔ Metrorrhagia

اس صورت میں حیض میں بے ترتیبی (Irregular) پائی جاتی ہے۔

3۔ عسر طمث (Dysmenorrhoea)

اس صورت میں حیض شروع ہونے کے دوران خواتین کے پیٹ کے نچلے حصہ میں درد ہوتا ہے۔

4۔ بانجھ پن (Infertility)

تقریباً 30 فیصد خواتین میں بانجھ پن پایا جاتا ہے۔

5 Abdominal swelling

مریض کو پیٹ میں سوجن کا احساس ہوتا ہے، اسے پیٹ کے نچلے

حصہ میں کوئی ابھار محسوس ہوتا ہے۔

تفتیشات (Investigations)

Ultrasonography کرانے سے عام طور پر Fibroids کی تشخیص ہوجاتی ہے اس کے علاوہ Laparoscopy, Magnetic Resonance Imaging, Uterine Curettage بھی Fibroids کی تشخیص میں معاون ہوتے ہیں۔

تشخیص فارقہ (Differential Diagnosis)

حمل (Pregnancy)، بھرا ہوا مثانہ (Full bladder) اور Ovarian Tumour سے اسکی تشخیص فارقہ کی جاتی ہے۔

علاج (Treatment)

اس کا علاج دو طریقوں سے کیا جاتا ہے۔

1-Medical Management

اس میں حیض کے خون کو کم کرنے والی دوائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً Danazol,Antifibrinolytics وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

2۔ جراحت (Surgery)

اگر دوائی علاج سے فائدہ نہ ہو اور Fibroids کا سائز بڑا ہو تو Surgery کے ذریعہ Fibroids کو جسم سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس میں تین طریقوں سے Surgery کی جاتی ہے۔ Myomectomy, Hysterectomy اور Endoscopic Surgery کے ذریعہ علاج کیا جاتا ہے۔

یونانی علاج (Unani Treatment)

مریضہ کو چند روز تک یہ نسخہ منضج پلا کر مسہل مناسب سے تنقیہ کامل کرایا جائے۔ تاکہ رسولیوں (Fibroids) کی افزائش موقوف ہوجائے اور مقامی دواؤں کے استعمال سے رسولیاں بتدریج تحلیل ہونے لگیں۔ تنقیہ کے بعد مریضہ کو ہر روز آبزن (Sitz Bath) میں بٹھائیں یا اس کے شکم پر نطول کریں۔ مادے کو تحلیل کرنے والے روغنوں کی مالش کریں۔ اور اسی قسم کے ضماد لگائیں۔

نسخہ منضج

گل بنفشہ، بادیان، شاہترہ، منڈی، گل سرخ، ملوخشک ہر ایک ۷ ماشہ تخم خربزہ، پرسیاؤشاں، گاؤزباں، تخم کثوث (پوٹلی باندھ کر) ہر ایک ۵ ماشہ کو پانی میں جوش دے کر گلقند ۳ تولہ حل کرکے اور چھان کر پلائیں۔ اس کے بعد حب ایارج سے یا مطبوخ افتیمون سے حسب قاعدہ تنقیہ کرائیں۔ لیکن ہر حالت میں مریضہ کو قوت کا پورے طور پر لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

نطول

گل بابونہ، اکلیل الملک، مرزنجوش، بیخ سوسن، زوفا خشک، تخم سویہ تخم خرطم، السی ہر ایک ۲ تولہ سب کو بیس سیر پانی میں خوب پکائیں۔ پھر چھان کر دواؤں کا ثفل رہنے دیں اور صاف پانی کو لوٹے کی ٹونٹی کی باریک دھار سے مریضہ کے شکم پر ڈالیں اور ان ہی دواؤں کے پانی میں مریضہ کو بطور آبزن کے بٹھانا بھی مفید ہوتا ہے۔

آبزن یا نطول کے بعد مریضہ کے شکم پر روغن بابونہ، روغن نرگس، روغن سویہ، روغن قسط وغیرہ کی بقدر مناسب مالش کرنی چاہیے۔

جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے ایک نہایت عمدہ ضماد خنازیری مادے کو تحلیل کرنے کے لیے تجویز کیا ہے جو رسولیوں کو بھی تحلیل کرتا ہے۔ اس کا نسخہ درج ذیل ہے

تخم میتھی 13 ماشہ، ایلوہ، مرمکی، اجوائن دیسی، تخم السی، ایرسا ہر ایک 6 ماشہ، زراوند مدحرج، مرچ سیاہ، پیپلا مول، چرائتہ، گوگل، اشق، راتینج، قسط تلخ، فرفیون، ہینگ ہر ایک ایک تولہ سب کو باریک پیس کر پانی کے ساتھ قرص بنا رکھیں، ان میں سے بقدر مناسب لے کر مکوہ سبز اور کشنیز سبز کے پانی میں گھس کر ضماد کریں۔

حوالہ جات

1۔ ڈی سی دتا، ٹکسٹ بک آف گائنی کولوجی، چوتھا ایڈیشن، نیو سنٹرل بک ایجنسی، نئی دہلی، 2005، صفحہ 253-269

2۔ حکیم سید محمد عبدالرزاق، تعلیم القابلہ موسوم بہ معالجات امراض نسواں، جید برقی پریس، دہلی، 1937، صفحہ 276-280

3۔ ڈاکٹر محمودہ انظر، رہنما امراض نسواں، ادارہ کتاب الشفا، نئی دہلی، 2009، صفحہ 154-155

4۔ اسٹنڈرڈ یونانی میڈیکل ٹرمینالوجی، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی، 2012، صفحہ 271

5۔ ٹے برس سائکلو پیڈیک میڈیکل ڈکشنری، ۲۱ واں ایڈیشن، ایف۔ اے۔ ڈے وس، کمپنی، فلاڈیلفیا، 2005، صفحہ 868

6۔ حکیم عزیز الرحمان اعظمی، وصی میڈیکل ڈکشنری، مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ، 2001، صفحہ 1481

Dr. Ehsan Rauf

476/6C Behind Madeh Ganj

Police Chowki, Sitapur Road

Lucknow-226020 (U.P)

حسن کی نگہداشت

چہرے پر برف سے مساج کے فائدے

روز صبح اپنے چہرے پر برف سے مساج کریں اور پائیں حیرت انگیز نتائج، جانیں چہرے پر برف کے مساج کے فوائد اور اس کا طریقہ کار اسکن آئسنگ کے بہت سے فوائد ہیں، صبح سویرے اگر آپ اپنے چہرے پر آئس کیوب سے مساج کریں تو اس سے آپ کو ایسے حیرت انگیز فوائد حاصل ہوں گے کہ آپ بھی حیران رہ جائیں گے، وہ بھی بنا مہنگے مہنگے پراڈکٹس استعمال کیے۔

یہ فوائد کیا ہیں جن سے آپ کی خوبصورتی میں اضافہ ہوسکتا ہے چلیں پھر جان لیتے ہیں۔

برف سے چہرے کے مساج کے حیرت انگیز فوائد

اگر آپ اپنے چہرے پر برف سے مساج کریں گے تو اس سے آپ کے چہرے کی جلد کی نیچے موجود خون کی شریانوں میں خون کی روانی بہتر ہوگی، جس سے آپ کا چہرہ تروتازہ ہوجائے گا اور اس پر ایک قدرتی چمک آئے گی۔

چہرے پر آئس کیوب سے مساج کرنے سے دانے اور دیگر جلد کے مسائل دور ہوتے ہیں چہرے پر موجود لال رنگت دور ہوتی ہے اگر الرجی وغیرہ کا سامنا ہو تو اس میں فائدہ پہنچتا ہے۔

آپ کی آنکھوں کے گرد موجود ہلکے بھی آئسنگ کی وجہ سے کم ہو جائیں گے اور ٹھنڈک کی وجہ سے آپ خود کو چاق و چوبند محسوس کریں گے۔

چہرے پر آئسنگ کرنے سے آپ کے کھلے مسام بند ہونے لگیں گے مگر اس کے لئے آپ کو باقاعدگی سے آئسنگ کرنی ہوگی، مسام بند ہو جانے سے آپ کا میک مزید دیر تک ٹھہرے گا اور اچھا نظر آئے گا۔

اگر آپ روزانہ چہرے پر آئس کیوب سے مساج کرنے کے عادت بنا لیں تو یہ وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہونے والی فائن لائنز اور جھائیوں سے نجات مل جائے گی۔

چہرے پر آئسنگ کرنے کا طریقہ کار

پانی میں گرین ٹی ڈال کر چھوڑ دیں جب اس کا عرق نکل جائے

اور پانی میں گھر جائے تو اسے آئس ٹرے میں بھر کر فریزر میں رکھ کر جما لیں اور پھر صبح سویرے اس سے چہرے کا مساج کریں، آپ کھیرے کا جوس، لیموں کا عرق وغیرہ کو بھی آئس کیوب بنا کر اس سے چہرے کا مساج کر سکتے ہیں، یاد رہے کہ آئس کیوب کو کسی کپڑے یا پیپر ٹاول میں لپیٹ کر استعمال کریں براہِ راست چہرے پر برف نہ رگڑیں، اب سرکیولر موشن میں چہرے کا مساج کریں، بہترین نتائج کے لئے یہ نسخہ روز آزمائیں حیرت انگیز فوائد حاصل ہوں گے۔

چہرے سے جھائیاں ختم کرنے کا طریقہ

چہرے کی جھائیاں اور جھریاں ختم کرنا چاہتی ہیں تو مہنگی کریم اور بیوٹی پراڈکٹس کا استعمال چھوڑیں اور جانیں کہ کیسے باورچی خانے میں موجود اجزاء سے آپ اپنی جلد کو جوان بنا سکتی ہیں۔

آج کل خواتین اپنے چہرے کے مسائل کے لیے بے شمار بیوٹی پراڈکٹس کا استعمال کرتی ہیں اور چہرے سے جھریاں، فائن لائینز اور جھائیاں ختم کرنے کے لیے مہنگی مہنگی کریموں پر ہزاروں روپے خرچ کرتی ہیں۔

مگر آج ہم بتانے جا رہے ہیں چند ایسے نسخے جن سے آپ خود گھر میں اپنے چہرے جھریوں کا علاج کر سکتی ہیں، وہ بھی بہت آسانی سے، تو چلیں پھر دیر کیسی طریقہ جان لیں۔

کھیرے اور ایلو ویرا کی کولڈ کریم:

کھیرے اور ایلو ویرا کی کولڈ کریم سے آپ کے چہرے میں نمی بحال ہوگی اور یہ آپ کی اسکن کو موسچرائز اور ہائیڈریٹ کرے گا، جس سے چہرے پر قدرتی نکھار آئے گا۔

اجزا: ایک چوتھائی کپ کھیرے چاپ کردہ، آدھا کپ تازہ دہی آدھا کپ تازے لیموں کا رس، ایک چوتھائی کپ ایلو ویرا جیل گرینڈ کیا ہوا

طریقہ استعمال: تمام اجزا کو ملا کر گرینڈر میں گرینڈ کر لیں، اب اسے باریک چھنّی میں چھان لیں۔ پھر اس آمیزے کو ایئر ٹائٹ کنٹینر میں ڈال کر رات بھر کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

اب روزانہ اس کریم کو آدھے گھنٹے کے لیے لیپ کی طرح چہرے پر لگائیں اور آدھے گھنٹے بعد سادے پانی سے دھو لیں۔

شہد تخم ملنگا اور سیب کا اسکرب: شہد چہرے کے کھلے مسام، اور ان میں موجود گندگی اور مٹی کو دور کرتا ہے، ساتھ ہی یہ جلد کو نرم و ملائم اور موسچرائز بھی کرتا ہے جبکہ سیب چہرے کی رنگت جو نکھارتا ہے اور بلیچنگ ایجنٹ کے طور پر کام کرتا ہے یہ اسکرب آپ کی جلد کو جوان بنائے گا۔

اجزا: آدھا کپ باریک چاپ کردہ سیب، 2 کھانے کے چمچ شہد، 2 کھانے کے چمچ تخم ملنگا

طریقہ استعمال: شہد، تخم ملنگا اور سیب کو گرینڈر میں ڈال کر گرینڈ کر لیں، گاڑھے پیسٹ جیسا آمیزہ بنا لیں چاہیں تو حسب ضرورت پانی کا استعمال کریں۔

اب اسے پانچ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پھر چہرے پر اس سے اسکرب کریں اور کچھ دیر بعد مساج کر کے نیم گرم پانی سے چہرہ دھو لیں۔

چاول اور دودھ کا کلینزر: چاول چہرے کے جلد کو ٹائیٹ کرتا ہے، مسام کو بند کرتا ہے، اس میں وٹامن ای کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے جو اسکن کو ایکسفولیٹ کرتی ہے، جبکہ دودھ قدرتی نکھار فراہم کرتا ہے۔

اجزا: ایک چوتھائی کپ چاول کا آٹا، 2 سے 3 چمچ دودھ

طریقہ استعمال: چاول کے آٹے کو دودھ میں ملا کر رکھیں۔

اب اس پیسٹ کو چہرے پر لگائیں۔ کچھ دیر مساج کرنے کے بعد لگا چھوڑ دیں۔

پھر چہرہ نیم گرم پانی سے دھو لیں اور کوئی ٹونر یا لوشن لگا لیں۔

(بحوالہ www.kfoods.com)

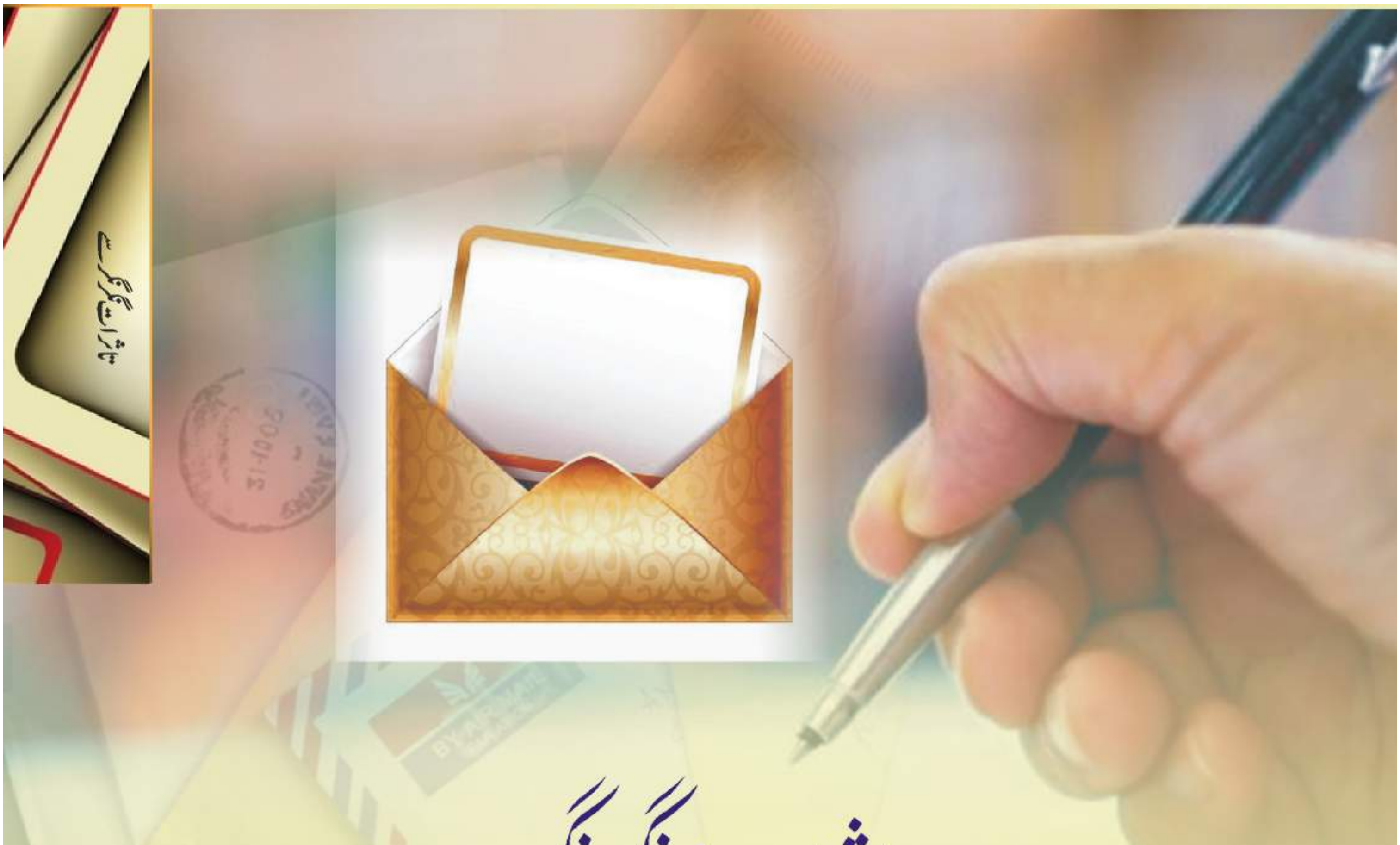

تاثرات: نگر نگر سے

مئی 2021 کا شمارہ نظر سے گزرا۔ جب میں نے میگزین دیکھی تو معلوم ہوا کہ سابقہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی لا جواب ہے اور معنی خیز تحریروں سے آراستہ ہے۔ 'خواتین دنیا' کی میں سالانہ خریدار ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ اس کے ہر شمارے میں ہمیشہ معیاری اور اعلیٰ پایہ کی تخلیقات ہی شائع ہوتی ہیں۔ لاک ڈاؤن کے پیش نظر عالمی وبا کورونا پر بہت سی تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ پچھلے کچھ شماروں میں اس وبا سے متعلق بہت سی تحریریں منظر عام پر آئیں ہیں۔

سابقہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی اپنے اندر بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس شمارے میں تقریباً آٹھ مضامین موجود ہیں جو مختلف نوعیت کے اور معیاری ہیں۔ شخصیت کے ذیل میں ڈاکٹر نوشین حسن کا مضمون درج ہے۔ ہاجرہ نازلی جو دیوبند سے تعلق رکھتی تھیں ان کا 2004 میں علی گڑھ میں چوراسی سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ بلا شبہ ایک عمدہ ناول نگار تھیں۔ مضمون نگار نے ان کے ناولوں کا بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔ ہاجرہ نازلی جس دور سے تعلق رکھتی تھیں اس دور میں عورتوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ہاجرہ نازلی نے باقاعدہ طور پر اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ انھوں نے گھر پر رہ کر ہی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے گھر میں ادبی ماحول تھا جس نے ان کے فن کو جلا بخشی۔ ہاجرہ نازلی نے عمدہ ناول اور افسانے تخلیق کیے۔

جہان نسواں کے تحت جو مضامین دیے گئے ہیں وہ بھی عمدہ اور اعلیٰ معیار کے ہیں۔ 'اردو میں ماحولیاتی تانیثیت' منفرد نوعیت کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں توصیف بریلوی نے ایکوفینزم کا اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ 'خواتین کے مسائل اور اخبارات' مضمون بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کہانیاں بھی اعلیٰ اور معیاری ہیں۔ عشرت ناہید کی کہانی بہت پسند آئی۔ نیلوفر پروین کی کہانی بھی اچھی لگی۔ نظمیں بھی ادبی معیار پر پوری اترتی ہیں۔ غرض یہ رسالہ ہر اعتبار سے لائق ستائش اور قابل مطالعہ ہے جو اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے۔

راحت پروین، ممبئی، مہاراشٹر

□□□

رضیہ سلطان بنی پہلی مسلم خاتون ڈی ایس پی

نئی دہلی۔ حال ہی میں بہار لوک سیوا آیوگ (BPSC) کے 64ویں امتحان نتیجوں کا اعلان کیا گیا ہے جس میں بہار کے دھنباد کی بیٹی رضیہ سلطان نے تاریخ رقم کی ہے۔ رضیہ سلطان بہار کی پہلی مسلم خاتون ڈی ایس پی بنی ہیں جو اپنے آپ میں بڑی بات ہے۔ رضیہ سلطان گوپال گنج ضلع کے ہتھوا سے تعلق رکھتی ہیں۔ رضیہ کا کنبہ اب بھی بوکارو میں رہتا ہے۔

بی پی ایس سی (BPSC) میں صرف 40 امیدواروں کو ڈی ایس پی عہدے کے لیے منتخب کیا گیا ہے جن میں سے 4 مسلم بھی ہیں، انہی چار امیدواروں میں سے ایک رضیہ سلطان بھی ہیں، ایک خبر کے مطابق رضیہ سلطان فی الحال بہار کے بجلی محکمہ میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر کام کر رہی ہیں یعنی رضیہ سلطان بجلی محکمے کو الوداع کہیں گی اور بہار کی پہلی مسلم خاتون ڈی ایس پی بن کر تاریخ رقم کریں گی۔

خبروں کے مطابق رضیہ کے والد محمد اسلم انصاری اسٹیل پلانٹ میں اسٹینوگرافر کے طور پر کام کرتے تھے جن کی سال 2016 میں موت ہو چکی ہے۔ اس خوشی بھرے موقعے پر رضیہ کی ماں کا کہنا ہے کہ رضیہ کی کامیابی ہماری کامیابی ہے اور اس سے ہمارا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں زندگی میں پہلی سب سے بڑی خوشی ملی ہے۔

رضیہ سلطان کے گھر والے بوکار میں رہتے ہیں ایسے میں رضیہ کی کامیابی پر ان کے رشتے داروں نے خوشی ظاہر کی ہے۔ ساتھ ہی ان کے گاؤں میں بیٹی کی اس کامیابی کے لیے خوشی کا ماحول ہے اور لوگ رضیہ اور ان کے خاندان کو مبارک باد دے رہے ہیں۔ رضیہ نے سال 2009 میں 10ویں اور سال 2011 میں 12ویں کا امتحان دیا تھا۔ ابتدائی تعلیم بوکارو پبلک اسکول میں ہی حاصل کی۔

(12 جون 2021، zeenews.india.com)

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد دوم

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

پہلی اشاعت: 2006

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 224، قیمت 120 روپے

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 600

قیمت: 265 روپے

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان

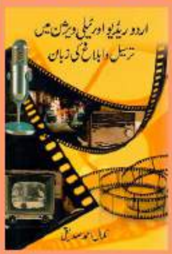

مصنف: کمال احمد صدیقی

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 646

قیمت: 280 روپے

अभ्यास पुस्तिका उर्दू कैसे लिखें

مصنف: گوپی چند نارنگ

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 98

قیمت: 50 روپے

مثالی طالب علم کیسے بنیں؟

مصنف: سعید احمد سندیلوی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 125

قیمت: 85 روپے

اردو ہندی فکشن میں اساطیر

مصنف: ناز قادری

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 290

قیمت: 150 روپے

تعلیمی نفسیات

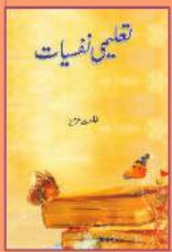

مصنف: طلعت عزیز

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 242

قیمت 130 روپے

منٹو کے نادر خطوط

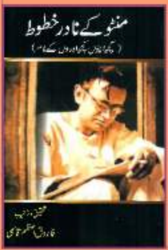

تحقیق و ترتیب: فاروق اعظم قاسمی

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 62

قیمت: 55 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जुलाई -२०२१ वर्ष: ५, अंक: ०७
Mahnama Khawateen Duniya Monthly July 2021, Vol. 5 , Issue:7
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-07-2021
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردوزبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردوکونسل کی منفرد پیشکش
اردوزبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردوکونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردوزبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6